لڑکیاں

جو نامور ہوئیں

ترجمہ و تالیف : اختر عزیز حسن

اضافہ و نگرانی : عبدالمجید سالک

★

ناشر

مکتبہ اردو لاہور

طبع اول ۱۹۵۸

تعداد ۱۰۰۰

قیمت پانچ روپے

ناشر

مکتبہ اُردو لاہور

بہ اشتراک

مکتبہ فرینکلن لاہور —— نیو یارک

چوہدری ظفر علی پرنٹر پبلشر نے پنجاب پریس سے چھپوا کر
مکتبہ اردو سے شائع کیا۔

فہرست مضامین

گزارش

"شخصی نمونہ" انسان کو آمادۂ عمل کرنے اور اس کی زندگی کو اخلاقی وعملی دوائر میں راہنمائی مہیا کرنے کے لئے اس قدر مؤثر واقع ہُوا ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ نے بھی ہدایت انسانی کے لئے اپنے کلام کے ساتھ ہی ساتھ ایک بشر کو دنیا میں بھیجا تاکہ وہ تمام ہدایات قرآنی پر عمل کر کے انسانوں کے لئے ایک ایسا نمونہ بن جائے جس کی تقلید کر کے وہ بلند ترین اخلاقی و علمی معیاروں پہ کاربند ہو سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادیبوں اور مصلحوں نے اہل عالم کی راہنمائی کے لئے تاریخ و سیرت کو بہت بڑی اہمیت دی ہے اور ہر زمانے میں بہترین انسانوں کی سوانح عمریاں لکھ کر انسانوں کے شوقِ تقلید کو اُبھارا ہے۔

امریکہ کی ایک مشہور مصنفہ سارہ کے بولٹن مختصر سوانح عمریوں کے لکھنے میں بڑا نام پیدا کر چکی ہیں۔ اور انہوں نے مشہور و نامور مردوں اور عورتوں کے حالات ایسی دلآویزی سے قلم بند کئے ہیں کہ امریکہ میں ان کی کتابیں لاکھوں کی تعداد میں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔ اور ان کے پڑھنے والوں کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا چلا جا رہا ہے۔

اس مصنفہ کی ایک کتاب کا نام ہے۔ "وہ لڑکیاں جو نامور ہوئیں"۔ اس میں یورپ اور امریکہ کی ان خواتین کے حالات فراہم کئے گئے ہیں جنہوں نے انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کے دوران میں تعلیم، تیمار داری اور فنونِ لطیفہ، ہوا بازی، سائنس دانی اور سیاست میں نام پیدا کیا۔ اور اپنے اپنے ملکوں کے علاوہ دنیا بھر کی علمی و فنی خدمت کی۔

بیگم اختر عزیز احمد نے کتاب مذکورہ سے دس ایسی خواتین کے حالات اخذ کئے ہیں جن کو ایشیائی ممالک کم و بیش جانتے ہیں۔ اور جن کی خدمتِ خلق اور عظمتِ عمل

کا ڈنکا دنیا بھر میں بج رہا ہے۔ ان کے علاوہ نو ایسی مسلمان خواتین کے حالات خود مرتب کر کے شامل کر دیئے ہیں جن کی زندگی کے نمونے عمل کے مختلف دائروں میں سبق آموز ہو سکتے ہیں۔ ناشرین کی فرمائش پر دسواں مضمون خالدہ ادیب خانم کے متعلق راقم الحروف نے لکھا ہے۔

قارئین کو ان خواتین میں حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ اور رابعہ بصریہؒ کے حالات بھی ملیں گے جو اس کتاب کی مغربی اور مشرقی خواتین کی سرگذشتوں سے بالکل الگ اور ممیز نظر آئیں گے۔ دنیاوی علوم و فنون اور سیاسیات میں کارنامے انجام دینے والی خواتین کے ساتھ ساتھ ان دو مقدس خاتونوں کے حالات صرف اس لیئے شامل کئے گئے ہیں۔ کہ مسلمان لڑکیاں اچھی طرح سمجھ لیں کہ ان کے معاشرے میں اخلاقِ عالیہ فقر و غنا اور عرفان و روحانیت کا مقام بے حد بلند ہے اور مسلمان عورت کو دنیاوی کامیابیوں کے ساتھ ہی ساتھ اپنی روحانی تربیت اور اخلاقی ترقی میں بھی کوشاں رہنا چاہیئے۔ اس مقصد کے لیئے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی حیاتِ مقدسہ اور حضرت رابعہ بصریہؒ کا زہد و فقر مسلمان لڑکیوں کے لیئے بہترین چراغ راہ ہے۔

ان کے علاوہ مسلمان خواتین میں حضرت محل اور خالدہ خانم جیسی مجاہدات نورجہاں، قرۃ العین طاہرہ، رعنا لیاقت علی خاں جیسی باہمت سیاسی شخصیتیں اور عطیہ بیگم فیضی اور زبیدہ آغا جیسی ماہرات فنونِ لطیفہ کے حالات قلمبند کئے گئے ہیں ہمیں یقین ہے کہ ان کے سوانح مسلمان لڑکیوں کے لیئے بے انتہا مفید ہونگے۔ مسلمان خواتین کے حالات میں مجھے یہ کمی محسوس ہوئی کہ خالدہ خانم ادیب کے سوانح درج نہ کئے گئے تھے۔ چنانچہ خاتون موصوفہ کے حالات میں نے خود لکھ کر شامل کر دیئے ہیں۔

چونکہ آج کل کے زمانے میں سائنس، سیاسیات اور خدمتِ خلق کے دائرے

نہایت وسیع ہو چکے ہیں۔ اور ان میں کامیابی حاصل کرنا ہر قوم کے لئے زندگی کا سرمایہ ہے۔ اس لئے پاکستانی لڑکیوں کو چاہیئے کہ اس کتاب میں جن یورپی اور امریکی نامور خواتین کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں ان کے حالات نہایت غور سے پڑھیں۔ اور جہاں تک ہو سکے ان سے اکتساب فیض کرنے کی کوشش کریں۔ بلاشبہ مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق۔ دونوں کے ماحول، مواقع، نشوونما اور امکانات میں بڑا فرق ہے۔ لیکن زمانے کی رفتار ایسی ہے کہ اب یہ فرق روز بروز کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور ساری دنیا ترقیات کے یکساں معیاروں کو اختیار کرتی چلی جاتی ہے۔ اس لئے مغربی خواتین کے حالات ہماری لڑکیوں کے لئے یقیناً خیال افروز ثابت ہوں گے۔

چونکہ بنیادی طور پر یہ کتاب سارہ کے بولٹن کی تالیف ہے۔ اس لئے اس میں مغربی خواتین کے حالات کو کتاب کی ترتیب میں پہلے رکھا گیا ہے اور مسلم خواتین کے سوانح اس کے بعد شامل کئے گئے ہیں۔ انصاف اور دیانت کا تقاضا بھی یہی تھا۔ اور ہماری تعلیمی مصلحت بھی اسی کی متقاضی تھی کہ مسلم خواتین کے سوانح و احوال کا نقش ہماری پڑھنے والیوں کے قلوب و اذہان پر آخر ہی میں جمے اور جما رہے۔

عبدالمجید سالک

جین ایڈمز
سماج کی خدمت گزار

سنہ ۱۸۶۰ء تا سنہ ۱۹۳۵ء

مشہور فلسفی سویڈن بورگ لکھتا ہے: "اصلی کارِ خیر یہ ہے کہ معاوضے کی تمنا کئے بغیر دوسروں کی خدمت کی جائے" جین ایڈمز اس تعریف کی مستحق ہے۔ اس نے شکاگو کے گنجان شہر میں 'ہل ہاؤس' قائم کیا جو اب تک بہت مشہور ہو چکا ہے۔ اس نے اپنی زندگی اور اپنی دولت ان کم نصیبوں کے لئے وقف کر دی جو غربت کا شکار تھے۔ لیکن اسے کارِ خیر کا اجر بھی کافی ملا کیونکہ اس کا شمار نہ صرف اپنے عہد کی عظیم ترین عورتوں میں ہوگا بلکہ وہ امریکہ کی مشہور ترین مخیّر خواتین میں گنی جائے گی۔

جین ایڈمز جس کے ہل ہاؤس کا امریکہ میں اور امریکہ سے باہر اس قدر اثر پھیلا، امریکہ کی ریاست الی نائس میں سیڈار ویل کے مقام پر ۶ ستمبر سنہ ۱۸۶۰ء کو پیدا ہوئی۔ اس کے اور بھی بہت بھائی بہن تھے جن میں وہ مقابلتاً کم عمر تھی۔ وہ ابھی گود ہی میں تھی کہ اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اس کا باپ کاروبار میں بڑا کامیاب آدمی تھا۔ وہ ریاست کی سینیٹ کا سولہ سال تک ممبر رہا۔ اُس نے خاندان کا شیرازہ بکھرنے نہ دیا۔

جین پیدائشی طور پر کمزور تھی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی خمیدہ تھی۔ اور وہ ساری عمر اس مرض میں مبتلا رہی۔ لیکن صحت کی خرابی کے باوجود وہ فطرت کے ہر پہلو کا

مطالعہ کرتی رہی ، اور بڑے ذوق و شوق سے علم کی تحصیل میں مصروف رہی ۔ وہ ابھی سات ہی سال کی تھی کہ اسے اس بات کا احساس ہونے لگا کہ زندگی میں سب کے نصیب یکساں نہیں ہوتے ۔ وہ ابھی بہت کم سن تھی ۔ اس لئے غربت کے اسباب اور نتائج کو سمجھ نہیں پاتی تھی ۔ لیکن قدرتاً اسے احساس ہوتا تھا کہ یہ فطرت کی بڑی ناانصافی ہے کہ کوئی امیر ہو اور کوئی غریب ۔ خود اس کا اپنا بیان یہ ہے کہ پہلی مرتبہ میں نے غربت کا نظارہ دیکھا تو میں نے اس فرق کو محسوس کیا کہ دیہات میں غربت کے باوجود صحت مندی ہے ۔ لیکن چھوٹے سے چھوٹے شہر میں غربت کے ساتھ نکبت اور غلاظت ہے جو گندی گلیوں میں نظر آتی ہے ۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنے والد سے یہ سوال کیا کہ لوگ اتنے چھوٹے چھوٹے گھروں میں ایک دوسرے کے اس قدر پاس پاس کیوں رہتے ہیں ؟ اور جب وہ مجھے جواب دے چکے تو میں نے بڑے وثوق سے اپنا یہ ارادہ ظاہر کیا کہ میں بڑے مکان میں تو ضرور رہوں گی مگر میرا مکان بڑے بڑے گھروں کے درمیان نہ ہوگا ۔ بلکہ ایسی ہی بدہئیت اور تکلیف دہ جھونپڑیوں کے درمیان ہوگا ۔" اس کی یہ تمنّا پوری ہوئی حالانکہ اس کی تمنّا کی تہہ میں جو جذبہ کارفرما تھا اس کی پوری طرح تشکیل نہ ہونے پائی تھی ۔

جب جین آٹھ سال کی ہوئی تو مساوات کی یہ آرزو جو اس کے دل میں چٹکیاں لے رہی تھی آزمائش کے دور سے گزری ۔ اسے ایک بڑا ہی اچھا سا نیا کوٹ ملا تھا جس پر اسے بڑا فخر تھا ۔ وہ اور اس کا باپ دونوں اتوار کے دن مدرسے جا رہے تھے ۔ اس مہربان دل شخص نے اپنی بیٹی سے کہا کہ اپنا اچھا سا کوٹ اتار دو اور پرانا کوٹ پہن لو کیونکہ وہاں اور بہت سے بچّے ہوں گے جنہیں ایسے اچھے اچھے کپڑے میسّر نہیں ، وہ ان کے دل پر چوٹ لگے گی ۔ جین لکھتی ہے " میں نے

یہ بات فوراً مان لی۔لیکن دل سے نہیں۔کیونکہ جب میں اپنے باپ کے ساتھ ساتھ گاؤں کی گلیوں میں سنجیدگی سے چلی جا رہی تھی تو میرا دل ابھی اس خوشی سے مانوس نہیں ہونے پایا تھا جو قربانی دینے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔"

مسٹر ایڈمز اس صلح پسند عیسائی فرقے میں پیدا ہوئے تھے جو کویکر کہلاتا ہے ان کے اپنے اعلیٰ خیالات اور نصب العین کا ان کی اولاد پر اثر ہونا ضروری تھا۔ وہ پریذیڈنٹ ابراہام لنکن کے دوست تھے اور لنکن نے ان کے نام جو خطوط لکھے تھے ان کا ان کی چھوٹی سی لڑکی کے دل پر بڑا اثر ہوتا تھا۔مسٹر ایڈمز کے متعلق کہا جاتا ہے کہ امریکہ کی خانہ جنگی کے بعد کے زمانے میں جب کہ ہر طرف رشوت کا بازار گرم تھا کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کو رشوت دے اور ہر بُرا شخص قدرتی طور پر ان سے ڈرتا تھا اگرت ۱۸۸۱ء میں مسٹر ایڈمز نے وفات پائی۔

۱۸۷۷ء میں جین ایڈمز، جس کی عمر اب سترہ سال کی تھی، الی نائس کے راک فرڈ سیمناری میں شریک ہوئی جو آگے بڑھ کے کالج بن گیا۔ یہاں وہ زیادہ تر یونانی زبان اور ریاضیات کی تعلیم حاصل کرتی رہی۔اس کا بیان ہے۔"دراصل مجھے تاریخ پڑھنے کا شوق تھا، کچھ تو اس وجہ سے کہ مجھے تاریخ کا ایک بڑا اچھا استاد ملا تھا۔کچھ اس وجہ سے کہ جب میں چھوٹی سی تھی میرے والد نے مجھ سے پلوٹارک کی لکھی ہوئی سوانحعمریاں پڑھنے کو کہا تھا۔ اور جب میں سوانحعمری پڑھ کے جو کچھ میری سمجھ میں آتا ہوشیاری سے دہراتی تو وہ ہر مرتبہ مجھے پانچ سینٹ انعام دیتے۔اسی طرح ارونگ نے واشنگٹن کی جو سوانحعمری لکھی ہے اس کی ہر جلد کے ختم کرنے پر وہ مجھے پچیس سینٹ انعام دیتے۔

کالج چھوڑنے سے پہلے ہی جین ایڈمز نے طے کر لیا تھا کہ وہ اپنی زندگی کس کام کے لئے وقف کرے گی۔ وہ چاہتی تھی کہ ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرے اور غریبوں کے ساتھ زندگی گزارے۔جوانی میں اسے غریبوں کی امداد کا جو احساس پیدا ہؤا وہ

دن بدن بڑھتا گیا اور گہرا ہوتا گیا۔ اور اس نے اپنے آپ کو اس مقصد کے لئے تیار کرنا شروع کیا کہ وہ اس احساس کو عملی صورت دے۔ راک فرڈ سیمناری سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد سردیوں میں وہ فلاڈلفیا کے زنانہ میڈیکل کالج میں شریک ہوگئی۔ مگر ریڑھ کی ہڈی کی بیماری کی وجہ سے اسے ڈاکٹر ویر مچل کے اسپتال میں داخل ہونا پڑا اور پھر اپنی صحت ٹھیک کرنے کے لئے اسے دو سال یورپ میں گزارنے پڑے۔

باہر کے ملکوں میں بھی وہ شہروں کے غریب محلوں سے زیادہ اُنس محسوس کرتی اور ان سب کی طرح جو امیری اور غریبی کے تفاوت کو دیکھ دیکھ کر رنجیدہ ہوتے ہیں اس نے بھی لندن کے ایسٹ اینڈ میں غریبوں کی فلاکت دیکھی اس نے انہیں شنبہ کی راتوں کو نیلام میں سڑے گلے پھل اور ترکاریاں خریدتے دیکھا۔ اس نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ سڑک کے کنارے بیٹھے بیٹھے بھوک کے مارے کچی ترکاری کھا گیا۔

جب وہ ڈریسڈن اور روما میں آرٹ کی تعلیم حاصل کر رہی تھی، ان کم تنخواہ پانے والے مزدوروں کو نہ بھول سکی جو بہت تھوڑا سا کھانا اپنے ساتھ دوپہر کو کھانے کے لئے لے جاتے ہیں۔ وہ ان عورتوں کو نہ بھول سکی جن کی انگلیاں کام کاج کرنے کی وجہ سے سوج کر گاجر کی طرح موٹی اور سخت ہوگئی تھیں۔ جب وہ امریکہ واپس آئی تو اس نے دو سال سردیاں بالٹی مور میں جان ہاپکنس یونیورسٹی میں اور گرمیاں الی نائس میں اپنے گھر میں بسر کیں۔ "میں مغرب کی ایک ریاست میں گئی جہاں میں نے رہن میں روپیہ لگایا تھا۔ وہاں کسانوں کی خراب و خستہ حالت دیکھ کر میں بہت متاثر ہوئی یہاں بہت عرصے سے قحط تھا۔ ایک منظر میں نے ایسا دیکھا جسے میں کبھی بھول نہیں سکی ایک احاطے میں بہت سے سؤر جمع تھے۔ ان کی پیٹھ کی ہڈیاں اونٹ کے کوہان کی طرح

اُبھر آئی تھیں - اور وہ سب مل کے ایک سُوئر کو کھا رہے تھے - جو یا تو قحط اور بھوک کی وجہ سے مر گیا تھا - یا وہ ان سب میں کمزور تھا اس لئے وہ دوسروں کا شکار بن گیا تھا

کسان کی بیوی اس منظر کو لاپروائی سے دیکھ رہی تھی - وہ مایوسی اور ناامیدی کا مجسمہ بنی اپنے خالی بے ہنگم مکان کے دروازے کے سامنے کھڑی تھی - دو بچے اس کے پیچھے تھے جنہیں وہ بار بار اس منظر سے چھپانے کے لئے پیچھے دھکیلتی تھی مگر وہ بار بار باہر نکل آتے تھے - ان کے بال سخت ، اور سورج کی تپش سے سیاہ ہو گئے تھے ان کے چھوٹے چھوٹے پیر اتنے کالے ، اتنے سخت تھے اور ان پر اتنے گہرے گہرے نشانات پڑ گئے تھے کہ وہ کسی جانور کے چپٹے پیر معلوم ہوتے تھے - یہ بچے نیم انسان معلوم ہوتے تھے ، اگرچہ بن مانس جو نیم انسان ہوتے ہیں بہت خوش و خرم سمجھے جاتے ہیں لیکن ان بچوں کے چہروں پر کہیں خوشی کا نام نہ تھا -

ان حالات اور مناظر کو دیکھ دیکھ کر جن میں انسان حیوانوں سے بدتر نظر آتے ہیں اس کے دل کو بڑی چوٹ لگی اور اس نے اپنی زندگی اس لئے وقف کر دی کہ جو انسان مصیبت میں گرفتار ہیں ان کی مدد کرے -

جب جین ایڈمز دوسری بار لندن گئی تو دیا سلائی بیچنے والی لڑکیوں کے ایک جلسے میں شریک ہوئی جنہوں نے ہڑتال کر رکھی تھی - وہ ان کی تنگ دستی ، کم تنخواہیں اور ان کے کاروبار کے عبرتناک حالات دیکھ کر بہت متاثر ہوئی - اس کا بیان ہے "انسانوں کی خلاکت کا یہ نقش ، ان دوسرے نقوش کو گہرا کر گیا جن کی وجہ سے میرے دل پر اتنی سخت چوٹ لگی تھی - اسے روز بروز یہ علم ہوتا جا رہا تھا کہ اگر انسان کے تمدن کو انسان کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال نہ کیا جائے تو وہ خود غرضی کا ذریعہ بن جاتا ہے - اور اس سے روح کو طمانیت نہیں حاصل ہو سکتی - وہ اپنے ماحول کے آرام و آسائش سے قطعاً مطمئن نہیں تھی -

اسی زمانے میں وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ بہت اچھا ہو گا کہ اگر شکاگو میں جہاں حاجت مند بہت زیادہ ہیں ایک ایسا مکان لیا جائے جہاں وہ خود اور اس جیسے اور لوگ جو غربا اور حاجت مندوں کی خدمت کرنا چاہتے ہیں مل جل کر کام کریں۔ جین ایڈمز نے اپنی اس نئی تجویز کا ایلن اسٹار سے ذکر کیا جو اس کی اسکول کی ساتھی اور پرانی سہیلی تھی۔ اور جو اس سفر میں اس کے ساتھ تھی اس نے بھی اس تجویز کی بڑے زور و شور سے حمایت کی۔

جنوری ۱۸۸۹ء میں جب یہ دونوں امریکہ واپس ہوئیں تو انہوں نے شکاگو میں ایک ایسے مکان کی تلاش شروع کی جہاں یہ اپنی تجویز کو عمل میں لا سکیں۔ بہت تلاش کے بعد انہیں ۳۳۵ ساؤتھ ہال سٹڈ اسٹریٹ میں ایک بڑا سا مکان مل گیا۔ اس وقت اس مکان کے نچلے حصے میں دفاتر اور گودام تھے۔ اور اس کے پیچھے ایک میلا کچیلا کارخانہ تھا۔ اس سے پہلے اس مکان کو کلیسا کی ایک جماعت لٹل سسٹرز آف دی پور (خواہران غربا) نے ضعیفوں کی سکونت کے لئے بھی استعمال کیا تھا۔ یہ مکان جو آگے چل کے ہل ہاؤس کہلایا اس طرح واقع تھا کہ اس کے ایک طرف تو ایک کفن دفن کرنے والا دفتر تھا اور دوسری طرف حجام خانہ تھا۔ جب جین ایڈمز نے یہ مکان حاصل کیا تو اس کی حالت زیادہ اچھی نہ تھی لیکن بہت جلد اس پرانے مکان کی مرمت ہو گئی، اور ۱۸ ستمبر ۱۸۸۹ء کو مس ایڈمز اور مس اسٹار اس مکان میں منتقل ہو گئیں۔

ہیلن کلور، اس مکان کی مالکہ تھی۔ وہ چارلس جے ہل کی رشتہ دار تھی جس نے کئی سال پہلے یہ مکان بنایا تھا، وہ اس منصوبہ میں اس قدر دلچسپی لینے لگی کہ اس نے اس کا کرایہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے اس منصوبہ کے لئے اس علاقے کی زمین پیش کر دی جس پر ہل ہاؤس کے تیرہ مکانات تعمیر ہوئے ہیں۔ ان مکانوں کا نام مسٹر ہل کے نام پر ہے۔

ہل ہاؤس پہلے شکاگو کے مضافات میں تھا، اب اس کے چاروں طرف اطالویوں یونانیوں، روسیوں، یہودیوں، بوہیمیوں اور دوسری قوموں کے لوگوں کی آبادی ہے اور ان کے دروازوں پران کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ جس زمانے میں مس ایڈمز ہل ہاؤس میں آئی ہے اس زمانے میں اس نواح کا ذکر اس نے ان الفاظ میں کیا ہے۔ گلیاں حد سے زیادہ غلیظ ہیں۔ اسکول ناکافی ہیں، کوئی صفائی کے قانون پر عمل نہیں کرتا۔ گلیوں کی روشنی خراب ہے۔ سڑک کا فرش بہت ابتر حالت میں ہے۔ چھوٹی چھوٹی گلیوں میں تو فرش ہے ہی نہیں، اصطبل اس قدر گندے ہیں کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ سینکڑوں مکان ایسے ہیں جن کے پانی کا نکاس شہر کی بدررؤں میں نہیں ہوتا اس لئے گندگی کی کوئی انتہا نہیں۔

مٹھائی کی دوکانیں بکثرت ہیں۔ ٹھیکیدار اس قدر ظالم ہیں کہ انہوں نے تاریک سے تاریک تہہ خانے، گندے سے گندے اصطبل، چھوٹے سے چھوٹے حجرے اپنے کاروبار کے لئے کرائے پر لے رکھے ہیں۔ کیونکہ ان مقامات کا کرایہ بہت کم ہوتا ہے خواہ مزدوروں کی صحت پر ان کا کچھ ہی اثر کیوں نہ پڑے۔"

بہت جلد اس نئی آبادکاری کی تجویز کے لئے رضا کار ملنے شروع ہو گئے۔ ایک عورت شہر کے شمال سے ہر روز صبح کو چھوٹے چھوٹے بچّوں کو پڑھانے کے لئے آجاتی۔ ایک اور عورت نے بچّوں کا کلب بنایا اور اس کا نام "ننھے ہیروؤں کا کلب" رکھا۔ اس کلب کے ننھے مُنّے ممبر پرانے زمانے کے بہادروں کے قصّے سنتے اور خود بھی ایک دن شہرت حاصل کرنے کے خواب دیکھتے۔ ہل ہاؤس میں پہلے کرسمس کے موقع پر مس ایڈمز نے لکھا ہے کہ "باوجود اس کے کہ میرا ہاتھ تنگ تھا اور مجھے بچّوں کے لئے مٹھائی اور جوتوں کا انتظام کرنا تھا میں نے بچّوں کے کلب میں کارل شوتنر کی لکھی ہوئی ابراہام لنکن کی سوانعمری کی پچّیس جلدیں تقسیم کیں۔"

لڑکیوں کے لئے سینے پرونے کی کلاسیں کھولی گئیں ۔ جو کپڑے وہ سیتیں وہ انہی کو دیدیئے جاتے اور وہ انہیں گھر لے جاتیں ۔ پکوان اور درزی کا کام سکھایا جاتا ۔ سولہ سال تک شیر خوار بچّوں کے لئے نرسری کا انتظام کیا گیا ۔ جین ایڈمز لکھتی ہے "ہمیں بہت جلد ان شیر خوار بچّوں کا تعارف حاصل کرنے کا موقع ملا ۔ جن کی غریب محنتی مائیں دن بھر محنت مزدوری کے لئے جاتی ہیں ۔ پہلے تو یہ اپنے بچّوں کو یا تو کسی ہمسائے کے سپرد کر جاتی تھیں یا زیادہ تر انہیں اپنے چھوٹے سے کمرے میں بند کر کے باہر سے قفل لگا دیتی تھیں ۔ اس پڑوس میں پہلے تین لنگڑے لُولے بچّے جو ہمیں ملے تھے ۔ اس لئے معذور ہو گئے تھے کہ ان کی مائیں باہر کہیں کام پر گئی ہوئی تھیں اور انہوں نے گر کے ہاتھ پاؤں توڑ لئے تھے ۔ ان میں سے ایک تیسری منزل کی کھڑکی سے گر پڑا تھا ، دوسرا جل گیا تھا ، تیسرے کی پیٹھ کی ہڈّی اس لئے ٹیڑھی ہو گئی تھی کہ تین سال تک دن دن بھر اسے باورچی خانے کی میز کے پائے سے باندھ دیا جاتا ، اور صرف دوپہر کو تھوڑی دیر کے لئے کھول دیا جاتا جب کہ اس کا بڑا بھائی جو فیکٹری میں کام کرتا تھا دوڑتا ہوا آتا ۔ دوپہر کا کھانا اس کے ساتھ کھاتا اور پھر اسے اسی طرح باندھ دیتا ۔

گرمیوں کے زمانے میں یہ ممکن نہ تھا کہ چُلبلے بچّوں کو بند کمروں کے اندر مقفّل کیا جائے ۔ چوروں کے ڈر سے یہ بھی ممکن نہ تھا کہ دروازے کھلے چھوڑ دیئے جائیں اس لئے کمرہ بند کر کے بچّوں کو ان کی مائیں دن بھر کے لئے باہر نکال دیتی تھیں ۔ ہم نے پہلی گرمیاں جو اس نواح میں گزاریں ان میں اکثر یہ ننھّے ننھّے غریب بچّے بھٹکتے بھٹکتے ہل ہاؤس کے برآمدے میں آ نکلتے ، ہم انہیں وہیں روک رکھتے ۔ دوپہر کو ان کو کھانا کھلاتے ۔ اور کبھی کبھی کوئی بچّہ کھانے کے معاوضے میں اپنی بھنچی ہوئی مٹھّی میں گرم گرم پیسہ ہماری طرف بڑھاتا ۔ یہ پیسہ اس کی ماں نے باہر جانے سے پہلے دیا ہوتا

کہ کچھ خرید کر کھا لینا۔ کنڈرگارٹن کا وقت گزرنے کے بعد ہمارے یہ ننھے مُنّے مہمان ہمارے سونے کے کمروں میں آ کے شور مچاتے۔ ہم میں سے کوئی ان کی نگرانی کرتا رہتا۔ بہرحال ان حالات کی وجہ سے ہل ہاؤس میں نرسری کا انتظام کیا گیا۔

نوروز کے دن ہل ہاؤس میں بڑے بوڑھوں کی دعوت کی گئی۔ پرانے محلّے والے جمع ہوئے۔ ضعیف ترین مہماں کو لانے کے لئے گاڑی کا بندوبست کیا گیا۔ یہاں سب تھوڑی دیر کے لئے اپنی اپنی مصیبتیں بھول گئے اور سب نے نئے سال کا استقبال کیا۔

لوگ "غریب گھر" کے نام سے ڈرتے تھے۔ جین ایڈمز نے کوک کنٹری کے ضعیف خانے سے بہت سے لوگوں کو دو ہفتے کے لئے چھٹی پر بلایا۔ یہاں ہل ہاؤس کے کافی ہاؤس میں انہیں دو وقت پیٹ بھر کے کھانا مل جاتا۔ بہت سے کارخانوں کے مزدور اسی کافی ہاؤس میں کھانا کھاتے تھے۔ ضعیف خانے سے جو لوگ آتے وہ دو ہفتے کی چھٹیوں کے بعد خوش ہو کے واپس جاتے۔ ان دنوں کی یاد باقی رہ جاتی اور وہ اس انتظار میں رہتے کہ اگلے سال وہ پھر دو ہفتے کے لئے بلائے جائیں گے۔ اس طرح جین ایڈمز نے ان کے لئے کسی قدر آسائش اور اس سے زیادہ امید بہم پہنچانے کا انتظام کر دیا۔

سنہ ۱۸۹۰ء میں مزدوروں کا سماجی علوم کا کلب قائم ہوا۔ اس میں بڑے مشہور مشہور آدمی ہل ہاؤس آ کے تقریر کرتے۔

محنت مزدوری کرنے والی لڑکیوں کی سکونت کے لئے ایک کلب امداد باہمی کے اصول پر جین کلب کے نام سے قائم کیا گیا اور فوراً ہی بہت مقبول ہو گیا۔ ایک ٹرسٹی کے ایک دوست نے اس کلب کے لئے عمارت کی تعمیر کے لئے بیس ہزار ڈالر کا عطیہ دیا۔ لیکن جب مسز ایڈمز کو پتہ چلا کہ جس شخص نے یہ عطیہ دیا ہے وہ اپنے

کارخانے کے مزدوروں کو بہت کم تنخواہ دیتا ہے تو اس نے یہ عطیہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کچھ سال بعد ہل ہاؤس کے ایک اور ہمدرد نے اس کلب کے لئے نیا مکان بنوا دیا۔ جاڑے میں موسیقی کی محفلیں ہوتیں اور ۱۸۹۳ء میں ہل ہاؤس میں موسیقی کا مدرسہ کھولا گیا۔ جین ایڈمز نے غریبوں کے ساتھ مل جل کر کام کرنے کا جو خواب دیکھا وہ اب روز بروز حقیقت بنتا جا رہا تھا۔

ہل ہاؤس کے علاوہ جین ایڈمز اور محاذوں پر بھی خلقِ خدا کی حمایت میں لڑ رہی تھی۔ اس نے بہت لڑ بھڑ کے الی نائس میں فیکٹریوں کا قانون پاس کرایا۔ جس کی رُو سے مٹھائی کی دوکانوں میں صفائی کے قاعدے مقرر کئے گئے اور یہ قرار پایا کہ چودہ سال سے کم عمر کے بچّوں کو مزدوری پر نہ لگایا جائے۔ وہ شہر شہر کا دورہ کرتی رہی اور اپنی تقریروں اور اپنے خلوص سے لوگوں کے ضمیر کو بیدار کرتی رہی۔ اس کی کوششوں سے اور بھی کئی اصلاحیں نافذ ہوئیں۔ مزدوروں اور سرمایہ داروں کے جھگڑے چکانے کے لئے ایک سرکاری بورڈ قائم کیا گیا جو ہڑتالوں کا تصفیہ کرے۔ سرکاری نگرانی میں تلاش روزگار کا ایک محکمہ کھولا گیا اور مزدوروں کے لئے اور بہت سی رعایات قانوناً رائج کی گئیں۔

ہل ہاؤس پہلے کی طرح اب بھی فلاح و اصلاح کی تحریکوں کا بہت بڑا مرکز ہے جین ایڈمز کی وجہ سے ان بستیوں کی اصلاح ہوئی جہاں دق پھیلتی ہے۔ اس کی وجہ سے عوام النّاس کے لئے حمام قائم کئے گئے۔ اس نے کوکین فروشی کے انسداد کی بڑی کوشش کی اور ۱۹۰۷ء میں اس کی کوشش سے کوکین فروشی کو قانوناً جرم قرار دیا گیا۔ جب ۱۸۹۹ء میں مجرم بچّوں کے لئے عدالت قائم ہوئی تو ہل ہاؤس نے اسے بڑی مدد دی، اور اس کی وجہ سے بچّوں کے جرائم میں خاصی کمی رہی۔ جین ایڈمز خود ہمیشہ یہ زور دیتی رہی کہ بچّوں کے لئے کھیل کے میدان اور ان کی ورزش اور تفریح

کے مواقع زیادہ سے زیادہ تعداد میں فراہم کئے جائیں تاکہ ان کی ذہنی اور جسمانی قوّت کا رُجحان اسی طرف رہے، جرائم کی جانب نہ ہونے پائے۔ اس مسئلہ کو اس نے اپنی کتاب "شہر کی گلیاں اور نوجوانی کا جوش" میں بہت زور دے کر بیان کیا ہے اپنے عمرانی نظریئے اور نصب العین کو اس نے اپنی اور تصنیفوں میں بیان کیا ہے جن کے نام یہ ہیں۔ "جمہوریت اور سماجی اخلاقیات" اور "امن کے نئے نصب العین"۔

جین ایڈمز چیکاگو کی مجلسِ تعلیم کی رکن تھی۔ سالہا سال وہ بڑے بڑے مجموں کے سامنے ملک بھر میں تعلیمی اور اصلاحی مسائل پر بڑے زور و شور سے تقریریں کرتی رہی۔ مئی ۱۹۱۰ء میں اس نے سینٹ لوئیس میں کارہائے خیر و اصلاح کی قومی کانفرنس کی صدارت کی۔ اس کے متعلق چیکاگو کومنز سوشل سٹلمنٹ کے بانی ڈاکٹر گراہام رذین ٹیلر کی یہ رائے ہے: "سینٹ لوئیس کی کانفرنس اگر اور کسی وجہ سے نہ سہی تو اس وجہ سے یادگار رہے گی کہ اس کی صدارت اور رہبری اس سال جین ایڈمز نے کی اور لوگوں کو کارِ خیر اور سماجی انصاف کے مسائل پر اس کی بنیادی رائے سننے کا موقع ملا۔"

۱۸۹۶ء میں وہ ٹائیفائڈ میں مبتلا ہوئی۔ اچھی ہوئی تو صحت کی اصلاح کے لئے یورپ گئی۔ یہاں روس میں اس کی ملاقات ٹالسٹائے سے ہوئی۔ اس سے اور یورپ کے دوسرے مشاہیر سے اسے گھنٹوں گفتگو کرنے کا موقع ملا۔

پہلی جنگِ عظیم کے چھڑ جانے کا اسے بڑا صدمہ تھا کیونکہ وہ بڑے خلوص کے ساتھ امن کی حامی تھی۔ وہ آئندہ لڑائیوں کی روک تھام کے لئے سرگرمی سے کام کرتی رہی اور عسکریت کے خلاف امریکن خواتین کی ایک انجمن کی مجلس عمل کی رکن بنی۔ عورتوں کی "جمعیتِ امن" کی پہلی صدر منتخب ہوئی اور "دائمی صلح کے لئے عورتوں کی بین الاقوامی کمیٹی" کی صدر بنائی گئی۔

۱۹۱۹ء میں اس کی خاص عزت افزائی یہ ہوئی کہ اسے عورتوں کی انٹرنیشنل

کانگریس کی صدر منتخب کیا گیا۔ ۱۹۱۵ء میں وہ ہاگ کی مجلس امن، ۱۹۱۹ء میں زیوریچ کی محفلِ امن، اور ۱۹۱۵ء میں وہ ہاگ کی محفلِ امن اور ۱۹۲۱ء میں دی آنا کی محفلِ امن میں شریک ہوئی۔

جن کتابوں کا ذکر کیا جا چکا ہے ان کے علاوہ اس کی ایک اور تصنیف "نیا ضمیر اور ایک پرانی خرابی" ہے۔ یہ ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئی۔ پانچ سال بعد اس نے عورتوں کی یادداشت کی راہِ دراز تصنیف کی۔ دو اور کتابیں ہل ہاؤس کے متعلق ہیں "ہل ہاؤس میں بیس سال" (۱۹۱۰ء) ہل ہاؤس میں اور بیس سال (۱۹۳۰ء)

عورتوں کے حقِ رائے دہندگی کی تحریک میں بھی جین ایڈمز نے سرگرمی سے حصہ لیا لیکن وہ صلح جوئی کے طریقوں کی زیادہ حامی تھی۔ جس قسم کا تصفیہ وہ پسند کرتی تھی اس کے متعلق فلا رنڈ ڈیل نے اپنی کتاب "دنیا کو تعمیر کرنے والی خواتین" میں یہ لکھا ہے۔" یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مس ایڈمز کی طبیعت میں ضد اور شدّت ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ان مصالحت پسندوں میں سے ہے جو بُرے امن کو اچھی لڑائی پر ترجیح دیتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ تخیّل کی بلندی کے ساتھ ہمدردی اس کی جبلّت میں داخل ہے۔ اس لئے لڑائی میں وہ اپنے حریف کو نفرت اور عداوت کی نظر سے نہیں دیکھ سکتی۔ وہ دونوں کے نقطۂ نظر کو جانچتی ہے اور ان میں سے ایک فریق غلط راستے پر سہی۔ لیکن وہ غلطی کرنے والے فریق کے دلائل بھی سمجھ سکتی ہے۔" جین ایڈمز نے خود یہ لکھا ہے۔" اگر مظلوم ہمیشہ حق پر ہو تو آسانی سے اس کی حمایت کی جا سکتی ہے۔ مشکل تو یہ ہے کہ وہ مبہم طور سے حق پر ہوتا ہے۔ لیکن وہ کبھی قطعاً غلطی پر نہیں ہوتا۔ اس کے مخالفین جو اسے سمجھ نہیں پاتے اور سب مشکلوں کی طرح تعصّب کی دیوار اپنے اور اسکے درمیان حائل کر لیتے ہیں۔"

۱۹۲۳ء میں جاپان جاتے ہوئے اس کا ایک بڑا خطرناک اپریشن ہوا۔ اس سے

وہ کبھی پنپنے نہ پائی۔ ۱۹۳۱ء میں جس روز یہ اعلان چھپا کہ اس کو اور ڈاکٹرنکولس مرے بٹلر کو امن کا نوبل پرائز ملا ہے، وہ دوسرے آپریشن کے لئے بالٹی مور کے جان ہاپکنس ہاسپٹل میں داخل کی گئی۔ ۲۱ مئی ۱۹۳۵ء میں پچھتّر سال کی عمر میں اس نے وفات پائی۔ جس ہمدردی اور محبّت سے اس نے بدنصیبوں اور غریبوں کی خدمت کی تھی۔ اسی مناسبت سے دنیا نے اس کی قدر اور عزّت کی۔

لویزا مے الکاٹ

مصنّفہ

سنہ ۱۸۳۲ء تا سنہ ۱۸۸۸ء

"ننھی عورتیں" (لٹل ویمن) امریکہ کا ایک بڑا مشہور ناول ہے یہ دلچسپ کہانی "مارچ" خاندان کے متعلق ہے، خاص طور پر چار بہنوں کے —— جن کے نام ہیں جو۔ ایمی، بیتھ اور مارگرٹ۔ لیکن دراصل یہ کہانی آپ بیتی ہے مصنّفہ لویزا مے الکاٹ اس کہانی میں "جو مارچ" کے آزاد تمسخر پسند کردار میں خود نمودار ہوتی ہے یہ کتاب محض سترہ اٹھارہ سال کی لڑکیوں میں ہی مقبول نہیں ہوئی بڑی عمر کے آدمی بھی اسے دلچسپی سے پڑھتے ہیں کیونکہ یہ مزاح، دردمندی، اور مسرت سے لبریز ہے اور اس کے کردار زندہ اور دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔

اس مقبولِ عام ناول کی مصنفہ نومبر سنہ ۱۸۳۲ء میں جرمن ٹاؤن پن سلوے نیا میں پیدا ہوئی۔ دوسری مشہور عورتوں کی طرح اس کی زندگی آسانی سے نہیں گوزری اور اس کے راستے میں بہت رکاوٹیں پیدا ہوتی رہیں۔ گیارہ سال تک اس کے باپ برون سن الکاٹ نے کامیابی کے ساتھ ایک مدرسے میں مدرسی کی۔ لیکن چونکہ مدرسی میں آمدنی قلیل ہوتی ہے اس لئے الکاٹ خاندان ہمیشہ تنگ دستی سے دوچار رہا۔ برون سن الکاٹ ترقی پسند معلّم تھا، وہ تعلیم کو طالب علموں کے لئے دلچسپ بنانا چاہتا تھا وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ میکانکی طور پر دلچسپی لئے بغیر بچّوں کو پڑھانا چلا جائے۔ وہ اپنے طالب علموں سے دوست کی طرح پیش آتا تاکہ وہ اس سے ڈریں

نہیں بلکہ اس سے محبت کریں۔ اس کے بعض مکالمات کو جو دنیا بھر کے لئے دلچسپی کا باعث ہیں مس الزبتھ پی باڈی نے کتابی صورت میں اکٹھا کیا ہے۔

لیکن نیو انگلینڈ میں مسٹر الکاٹ کی فراخدلی کو عیب گردانا گیا اور یہ کتاب روایات کے خلاف قرار دی گئی ہے۔ رالف والڈو ایمرسن جو خود بھی اسی قسم کا مقابلہ کر چکا تھا لوئیزا کے باپ کی حمایت پر آمادہ ہوا لیکن مخالفین برابر جمے رہے۔ پروفیسر الکاٹ نے اپنے مدرسے میں نیگرو لڑکوں کو بھی داخل کر رکھا تھا، بہت جلد اخباروں میں اس کے متعلق گرما گرم بحث ہونے لگی۔ اخباروں کے اس شور و غل کی وجہ سے اسکول میں لڑکوں کی تعداد کم ہوتی گئی۔ ۱۸۳۹ء میں اسکول کو بند کر دینا پڑا اور الکاٹ خاندان وہاں سے ہجرت کر کے کون کارڈ (ماسوچوسٹیس) منتقل ہو گیا۔

اس شہر میں بہت سے پڑھے لکھے صاحبِ استعداد لوگ ایسے تھے کہ یہ مدرس جو فلسفی بھی تھا ان کے سامنے اپنے نظریات اور نصب العین بیان کر سکتا تھا۔ ایمرسن بھی کون کارڈ ہی میں ایک معمولی سے دو منزلہ مکان میں رہتا تھا جس کے سامنے اخروٹ کے درخت لگے تھے۔ ایک اور روشن دماغ، آزاد خیال، مفکر، تھورو قریب ہی اپنی حسین جھیل والڈن کے کنارے تن تنہا رہتا تھا۔ جہاں اگر کوئی آواز آتی تھی تو کسی ملاح کے چپو کی آواز یا کسی چڑیا کے چہچہانے کی آواز۔ یہاں مشہور مصنف ہاتھارن بھی رہتا تھا جس کے متعلق اولیور وینڈل ہومز نے لکھا ہے کہ "وہ سوچتے سوچتے ایسی دنیا میں کھو گیا جہاں خوابوں کے باسی آباد تھے۔"

مسٹر الکاٹ بہت کم خرچ پر کان کورڈ میں رہ کے اپنی چاروں لڑکیوں کو تعلیم دے سکتا تھا۔ لوئیزا سب سے بڑی تھی۔ اس میں پھرتی بھی سب سے

زیادہ تھی، طبیعت میں جوش تھا۔ بڑی صفائی سے بات چیت کرتی تھی اور اپنی صاف گوئی کی وجہ سے اکثر مشکل میں پھنس جاتی۔ اپنی ہم شبیہہ "جو مارچ" کی طرح وہ بھی "ٹام بوائے" مردانہ خصائل کی لڑکی تھی اور اس کی طبیعت میں ہوا کی سی آزادی تھی۔ ایک مرتبہ جو کی بہن ایمی نے جو آرٹ کی بڑی دلدادہ تھی اسے سیٹی بجانے پر ٹوکا تو جو نے کہا "مجھے بناوٹ کی الٹی سیدھی باتیں پسند نہیں۔ میں قطعاً نوجوان خاتون نہیں، اور اگر بال سنوارنے سے میں نوجوان خاتون سمجھی جانے لگوں گی تو میں کہے دیتی ہوں کہ بیس سال کی عمر تک اسی طرح دوہری چوٹیاں ڈالے رہوں گی۔ سمجھیں! میں سچ کہتی ہوں جب میں سوچتی ہوں کہ ایک دن بڑی ہو جاؤں گی اور مس مارچ کہلاؤں گی، اور لمبے لمبے فراک پہنوں گی اور چینی مورتی کی طرح سنجیدہ نظر آؤں گی تو مجھے گھن آنے لگتی ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ میں لڑکی بنی، حالانکہ مجھے لڑکوں کے کھیل اور لڑکوں کے کام کاج پسند ہیں۔" جو کی اس تصویر میں لوئیزا مے الکاٹ نے اپنا نقشہ کھینچ دیا ہے۔

پندرہ سال کی عمر میں جو کی طرح لوئیزا بھی بہت لمبی، دبلی اور سانولی سی تھی اور خچر جیسی لگتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا اپنے لانبے لانبے ہاتھوں پیروں کا کیا بنائے جو اس کے ہر کام میں دخل انداز ہوتے تھے۔ اس کے ہونٹ یوں جمے رہتے گویا وہ جو کچھ طے کرنا تھا طے کر چکی ہے، اس کی ناک دیکھ کے ہنسی آتی تھی۔ اس کی آنکھیں بھوری بھوری تیز تیز تھیں۔ معلوم ہوتا تھا ان آنکھوں سے وہ ہر چیز دیکھ لیتی ہے، کبھی ان آنکھوں سے غصہ برستا، کبھی مسخرا پن، کبھی سوچ بچار۔ اگر اس میں حسن کی کوئی علامت تھی تو صرف ایک۔ اس کے لمبے گھنے بال لیکن وہ ان سے جان چھڑانے کے لئے انہیں جالی میں سمیٹے رکھتی۔ ...... اس کے ہاتھ پیر بڑے ہو گئے تھے، کپڑے معلوم ہوتا تھا اب اڑ جائیں گے۔ اس کو دیکھ

کے رحم آتا تھا کہ بے چاری ابھی تو لڑکی ہے اور ابھی کچھ ہی دن میں جلدی سے عورت بن جائے گی اور بچاری کو عورت بننا بالکل پسند نہیں۔

چاروں بہنیں عسرت کی تکالیف کے باوجود کون کورڈ میں ہنسی خوشی رہتی تھیں۔ ناشتے میں دودھ روٹی کھاتیں تاکہ اپنے حصّے کا کھانا ایک غریب نادار عورت کو دے دیں جس کے چھ بچّے تھے، وہ عورت ان کو "فرشتہ صفت بچّیاں" کہتی تھی۔ یہ سن کے لُویزا بہت خوش ہوتی۔ چاروں لڑکیاں ایک اسٹیج بنالیتیں اور ہمسایوں کے لئے ڈرامہ کرڈالتیں۔ اور ہمسائے بہت خوشی اور محبّت سے ڈرامے دیکھنے آتے۔

لُویزا خاص طور پر شکسپیئر، گوئٹے، ایمرسن اور ژارژ ساں کو بڑی دلچسپی سے پڑھتی۔ بہت کم سِنی میں اسے لکھنے کا چسکا پڑ گیا۔ جب وہ آٹھ سال کی ہوئی تو اس نے آٹھ مصرعوں کی ایک نظم لکھ ڈالی۔ یہ ایک چڑیا سے خطاب تھا۔ تیرہ سال کی عمر میں اس نے ایک اور نظم تصنیف کی جس کا عنوان تھا "میری سلطنت"۔ یہ بھی آٹھ مصرعوں کی تھی۔

لُویزا نے بڑے غضب کا تخیّل پایا تھا۔ وہ اپنی بہنوں کو کسی نہ کسی بہانے کہانیاں سناتی رہتی۔ سولہ سال کی عمر میں نوجوان مصنّفہ نے طے کیا کہ اب ایک ناول لکھ ڈالنا چاہیئے۔ اس کا نام اس نے "پھولوں کی کہانیاں" رکھا۔ چھ سال کے بعد یہ کتاب چھپی لیکن اس کی شہرت بالکل نہیں ہوئی۔ ابھی تک اس کے قلم میں پختگی نہیں آئی تھی۔ اور اسلوب میں بڑا تصنّع تھا۔ اب لُویزا کی تمنّا تھی کہ اپنی روزی آپ کمائے۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے برتن دھونا تاآں کہ کوئی نوجوان آکے اس سے شادی کی ہامی بھرے —— نہیں یہ اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ وہ خود "ننھی عورتیں" میں لکھتی ہے: "جو کی تمنا یہ تھی کہ کوئی بہت بڑا کارنامہ کر دکھلائے۔

یہ کارنامہ ہو گا گیا۔ اس کا اسے کچھ پتہ نہ تھا۔ وقت آئے گا تو خود بخود معلوم ہو جائے گا۔"

لُویزا مے الکاٹ ابھی سولہ سال کی ہی تھی کہ اس نے مدرسے میں پڑھانا شروع کر دیا۔ اس کا باپ تو دینیات کے درس دیا کرتا۔ وہ بیسوں شاگردوں کو مزے مزے کی خیالی کہانیاں سنایا کرتی۔ اس طرح اس کی محنت کی زندگی کا آغاز ہُوا۔ پندرہ سال اس نے محنت اور نوکری کی۔ اسے تجربے ہوئے کبھی اچھّے اور کبھی تلخ۔ لیکن دنیا کے انہی تجربوں نے اسے سمجھ بوجھ اور ہمدردی کے ساتھ لکھنا سکھایا۔

محنت کے کچھ سال بوسٹن میں گزرے۔ کبھی وہ کسی معذور بچّے کو سنبھالتی۔ کبھی کسی بچّے کی نگرانی پر مامور رہتی۔ کبھی سینے پرونے کا کام کرتی۔ شام کو گھنٹوں میز پر بیٹھ کے لکھتی۔

وہ انّیس سال کی تھی کہ اس کی پہلی کہانی ایک رسالے میں شائع ہوئی جس کا نام "گلیزنس پکٹوریل" تھا۔ اس کو اپنی تحریر کو چھپا ہوا دیکھنے کی مسرّت بھی ہوئی اور پانچ ڈالر کا گراں قدر معاوضہ بھی ملا۔ کچھ مہینے بعد "بوسٹن سیٹرڈے گزٹ" کو اس نے ایک اور کہانی بھیجی "گانے والیوں کی رقابت"۔ اب کے اس کی بڑی ہمت افزائی ہوئی۔ دس ڈالر معاوضہ ملا اور ایڈیٹر نے چٹھی لکھی کہ اور تحریریں بھیجیے۔ لُویزا نے "گانے والیوں کی رقابت" کو ڈرامہ بنا ڈالا۔ ایک تھیٹریکل کمپنی اس کو اسٹیج کرنے کو تیار بھی ہو گئی لیکن ایکٹروں میں آپس میں جوتا چل گیا اور ڈراما طاقِ نسیاں کی زینت ہو گیا۔ خیر اس کے عوض میں اسے چالیس راتوں کے لیے تھیٹر کا مفت پاس مل گیا۔ اسے ڈرامے اتنے پسند آئے کہ اس نے خود ایکٹرس بننے کا ارادہ کر ڈالا۔ اور ایک معاہدے پر دستخط بھی کر دیئے۔ لیکن قسمت پھر دغا دے گئی۔ تھیٹر کے مینجر

کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور اس کے بعد ہی معاہدہ منسوخ ہو گیا۔

اس نے سیٹرڈے ایوننگ گزٹ کے لئے ایک اور کہانی لکھی، اور ذرا مشہور ہونے لگی۔ وہ لکھتی ہے کہ "میں عمر بھر وہ لمحہ نہ بھولوں گی جب کہ جاڑوں کے زمانے میں گھر سے اسکول جاتے ہوئے میری نظر ایک پوسٹر پر پڑی جس پر یہ جاذب نظر عبارت درج تھی "گانے والیوں کی رقابت" کی مصنفہ کی نئی کہانی "برتھا" سیٹرڈے ایوننگ گزٹ کے نئے پرچے میں شائع ہو گی"۔ مجھے اسکول جانے میں دیر ہو گئی تھی۔ بڑی شدید سردی تھی۔ لوگ مجھ سے ٹکرا کے گزر رہے تھے، مجھے بڑا اندیشہ تھا کوئی مجھے پہچان نہ لے، پھر بھی میں وہیں کھڑی رہی، اور اس جاذب نظر پوسٹر کو گھورتی رہی۔ میں نے اپنے آپ سے ونسنٹ کرملز کے الفاظ دہرائے "یہ۔ یہ تو شہرت ہے"۔ اس دن میں نے اپنی شاگردوں سے بڑی رعایت برتی۔ "جب وہ برتنوں کو کھڑکا رہے تھے میں لافانی تصنیفوں میں مصروف تھی۔ جب وہ حساب کے پہاڑے سنا رہے تھے تو میں اس دولت کا خواب دیکھ رہی تھی جو میں اپنے قلم کے زور سے پیدا کروں گی۔ اس سہ پہر کو میری بہنوں نے بھی اس مشہور پوسٹر کی زیارت کے لئے سفر کیا۔ ہوا سے پوسٹر پھٹ گیا تھا۔ میری بہنیں ہمت کر کے اسے چرا لائیں اور جوش سے بھرے ہوئے خاندان کے آگے اسے پرچم کی طرح لہرانے لگیں۔ یہ پھٹا پرانا پوسٹر اب بھی موجود ہے اور اس زمانے کی دوسری یادگاروں کے ساتھ تہ کیا رکھا ہے۔ وہ بڑی مشکل کا زمانہ تھا۔ لیکن بڑا پیارا زمانہ تھا جب یہ چھوٹی چھوٹی کامیابیاں نصیب ہوئی تھیں۔ جوانی کے زمانے میں زندگی کی سخت محنت بھی حسین خواب دکھائی دیتی ہے"۔ ممکن ہے کہ پہلی کامیابی کی یہ پھٹی پرانی نشانی لوئیزا کو بعد کی عظیم الشان کامیابیوں سے زیادہ عزیز ہو!

یہ دیکھ کر کہ حیرت انگیز کہانیوں سے آمدنی کافی ہو سکتی ہے۔ لُویزا نے اس پر توجہ کی وہ مہینہ بھر میں دس بارہ کہانیاں لکھ ڈالتی۔ اس نے اپنے ناول "ننھی عورتیں" میں جو کے متعلق لکھا ہے۔ "جب تک رسالہ اسپریڈ ایگل اسے ایک ڈالر فی کالم کے حساب سے اس کی "خرافات" کا معاوضہ ادا کرتا رہا، جو اپنے آپ کو ذی حیثیت سمجھتی رہی اور محنت سے چھوٹی چھوٹی رومانی کہانیوں کا تانا بانا بنتی رہی۔ لیکن اس کے مصروف اور باحوصلہ دل و دماغ میں بڑی بڑی تجویزوں کی ہنڈیا پک رہی تھی اور ٹین کی چھت والے باورچی خانے میں مسوّدوں کا ڈھیر اونچا ہوتا گیا۔ ان کی وجہ سے ایک دن مارچ (جو کا خاندانی نام) کے نام کو چار چاند لگنے والے تھے۔"

ان حیرت ناک کہانیوں کے معاوضے میں لُویزا کو پیسے تو ملنے لگے تھے مگر شہرت میں اضافہ نہیں ہُوا اور وہ جلد ہی اکتا گئی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اس نے ایک ناول "موڈسس" لکھا، اس کا بھی وہی حشر ہُوا جو اس کے پہلے ناول "پھولوں کی کہانیاں" کا ہُوا تھا۔ لیکن اس نے محض تھوڑے عرصے کے لیے ہمّت ہاری۔ کچھ عرصے بعد اس نے ماہنامہ اٹلانٹک کے ایڈیٹر کو ایک کہانی بھیجی، ایڈیٹر نے انکاری چٹھی کے ساتھ کہانی واپس کر دی اور نیک نیّتی سے مشورہ دیا کہ تم پڑھانے ہی کی طرف توجہ کرو کہانیاں لکھنا تمہارے بس کا روگ نہیں۔ لیکن وہ ایڈیٹر کی اس فوری رائے کی قائل نہیں رہی اور اس نے لکھنا ترک نہیں کیا۔

اس عرصہ میں خانہ جنگی کے باعث ملک بھر میں تہلکہ مچ گیا۔ لویزا کی عمر اب تیس سال کی تھی۔ اس نے طے کیا کہ واشنگٹن جاکے سپاہیوں کے اسپتال میں نرس بن جائے۔ سرکاری کارروائیوں میں کئی مہینے لگ گئے، جب وہ اسپتال میں کام کرنے لگی تو اس کے آس پاس ہزاروں زخمی اور مرتے ہوئے سپاہی تھے جو فریڈرکس برگ

کے میدان میں شکست کے بعد لائے گئے تھے ۔ اس دور کے تجربے کا وہ ان الفاظ میں ذکر کرتی ہے " بڑے آتش دان کے چاروں طرف جیسا اندوہ ناک جم غفیر میں نے دیکھا، اس سے پہلے یا اس کے بعد پھر کبھی نہیں دیکھا۔ شکستہ حال، خستہ دل، زرد مٹی میں لت پت سپاہی کئی کئی دنوں کی بندھی ہوئی پٹیاں ویسی ہی بندھی ہوئی تھیں۔ بہت سے لوگ کمبلوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ ان کے کوٹ یا تو گم ہو گئے تھے یا ان کے لئے بیکار تھے۔ ان سب کے چہروں پر مایوسی طاری تھی جن پر شکست صاف لکھی تھی۔ یہ برن سائڈ کی لڑائی کی غلطیوں کے زندہ اشتہار تھے مجھے ان پر اتنا ترس آتا تھا کہ ان سے بات کرنے کی ہمت نہ کر سکی میں چاہتی تھی کہ ان میں جو سب سے زیادہ زخمی اور مصیبت زدہ ہیں ان کی خدمت کروں۔

اتنے میں ایک حکم نامہ آیا " ان سے کہو کہ موزے کوٹ اور قمیص اتار دیں۔ ان کے جسم کی اچھی طرح مالش کرو۔ انہیں صاف کپڑے پہناؤ ۔ پھر خادم انہیں بستروں پر لٹا دیں گے ۔"

وہ لکھتی ہے " اتفاق سے مجھے ایک بوڑھے آئرستانی کی خدمت کا موقع ملا جس کے سر میں زخم تھا جس کی وجہ سے اس کے سر کی شکل ایک باغ کی سی ہو گئی تھی ۔ پٹیاں اس طرح بندھی تھیں جیسے باغ کی روشیں ہوں اور سر کے بال ایسے تھے جیسے باغ کے درخت ۔ وہ کہتا تھا کہ یہ اس کی بڑی عزت افزائی ہے کہ ایک خاتون اسے نہلائے وہ اس طرح اپنی آنکھیں گھماتا تھا اور مجھے دعائیں دیتا تھا اور اس کا لہجہ ایسا عجیب تھا کہ میں ہنسی ضبط نہ کر سکی اور ہم دونوں مل کر ہنسنے لگے اور جب میں نے جھک کے اس کے جوتے اتارنے چاہے تو اس نے کہا نہیں میں آپ کو ہرگز ان گندے گڑھوں کو ہاتھ نہ لگانے دوں گا۔

جب کھانا آیا تو اس نے ایک سپاہی کو جو بری طرح زخمی تھا کھانا کھلایا،

اور پھر اس کے ساتھی کو کھانا کھلانا چاہتی تھی مگر اس نے جواب دیا، "شکریہ میڈم! لیکن میں شاید اب کبھی کھانا نہ کھا سکوں گا۔ کیونکہ میرے پیٹ میں گولی لگی ہے۔ ہاں اگر آپ کو فرصت ہو تو مجھے ذرا سا پانی دے دیجئے۔"

میں پانی لانے دوڑی۔ لیکن پانی کے گھڑے بھرنے کے لئے گئے ہوئے تھے اور ان کے آنے میں دیر لگی۔ میں اپنے مریض کو نہیں بھولی، اور جیسے ہی پانی آیا میں اس کے لئے گلاس بھر کے لے گئی۔ معلوم ہوتا تھا اسے نیند آگئی ہے۔ اس کی آنکھ کی پتلی کھنچ گئی تھی جس کی وجہ سے مجھے شک ہوا۔ میں نے ہاتھ لگایا تو وہ سانس بھی نہیں لے رہا تھا۔ میں نے اس کی پیشانی کو ہاتھ لگایا۔ ٹھنڈی تھی۔ میں نے اس پر چادر ڈال دی۔ آدھے گھنٹے بعد اس کا بستر خالی ہو گیا۔"

لیکن اس محنت سے اس کے اپنے قویٰ جواب دینے لگے۔ کچھ ہی عرصے بعد اس نے ایک کتاب لکھی "اسپتال کے نظارے" جو ۱۸۶۵ء میں شائع ہوئی۔ اسی سال وہ ایک مریضہ کی سہیلی بن کے یورپ گئی اور اس نے ایک سال جرمنی، سوئٹزرلینڈ، پیرس اور لندن میں گزارا۔

۱۸۶۸ء میں لُویزا کا باپ اس کی کہانیوں کا ایک مجموعہ ایک ناشر کے پاس لے گیا کہ کتابی صورت میں شائع ہو جائے۔ ناشر کو کہانیوں سے دلچسپی نہ تھی اس نے مسٹر الکاٹ کو مشورہ دیا کہ اس کی لڑکی لڑکیوں کے لئے ایک ناول لکھے۔ لُویزا کو یقین تھا کہ یہ اس کے بس کی بات نہیں۔ اس کے دو ناول ناکامیاب ہو چکے تھے پھر بھی اس نے جم کے لکھنا شروع کر دیا۔ یہ ناول "ننھی عورتیں" تھا۔ دو مہینے میں پہلا حصہ ختم ہو گیا۔ اور اکتوبر ۱۸۶۸ء میں شائع ہو گیا۔ یہ کون کورڈ والے مکان میں اس کی اپنی اور اپنی تین بہنوں کی سیدھی سادی اور سچی کہانی تھی۔ دوسرا حصہ ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا۔ لُویزا کو بڑی شہرت نصیب ہوئی۔ اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے

نارتھ کو کھاز کئی سال کی سخت محنت و مشقت کا دشوار گزار راستہ اس سال آسان ہو گیا۔ میں بے حد شکر گزار ہوں کہ خود بخود بہت سی دشواریاں حل ہوتی جا رہی ہیں۔

جب اس کے اگلے ناول "ننھے آدمی" کا اعلان ہُوا تو اشاعت سے پہلی ہی پچاس ہزار جلدیں فروخت ہوگئیں۔ اسی زمانے میں لُویزا نے اپنی فنکار بہن مے کے ساتھ روم کا سفر کیا۔ مے کو "ننھی عورتیں" میں اس نے ایمی کا نام دیا ہے۔ واپس آکے اس نے سفر کے متعلق ایک خاکہ "شال کے پٹے" لکھا۔ کچھ عرصہ بعد ایک اور ناول "دقیانوسی خیال کی لڑکی" شائع ہوا۔ اس کے بعد ایک ناول "لالوں کے سائے میں" ایک ناول "آنٹ جو کی پٹاری" چھ جلدوں میں۔ اور ایک اور ناول "جیک اور جل" ان کے علاوہ اور بھی۔

لُویزا مے الکاٹ نے ۶ مارچ ۱۸۸۸ء کو اپنے لائق باپ برون سن الکاٹ کے مرنے کے تین روز بعد وفات پائی۔ لیکن اس کی شخصیت آج بھی جو مارچ کے واضح کردار میں زندہ ہے۔ جو مارچ "ننھی عورتیں" والی چاروں بہنوں میں سب سے زیادہ زندہ دل اور دلچسپ تھی ؀

الزبتھ بلیک ویل

طیبہ

سنہ ۱۸۲۱ء تا سنہ ۱۹۱۰ء

سنہ ۱۸۰۰ء کی بہت سی کامیاب خواتین کی طرح الزبتھ بلیک ویل کو بھی سب سے زیادہ ان تعصّبات کا مقابلہ کرنا پڑا جو عورتوں کے کاروباری زندگی میں حصہ لینے کے راستے میں حائل تھے۔ بہت سے کالجوں کو ان لڑکیوں سے کوئی ہمدردی نہ تھی جو اعلےٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ اور اگر کوئی بلند ہمت لڑکی کسی کالج میں داخلے کی درخواست دیتی تو اس کے راستے میں مخالفت کی سنگین دیوار حائل ہو جاتی۔ لیکن سنگین دیواروں کو بھی عبور کیا جا سکتا ہے۔ الزبتھ بلیک ویل جیسی خواتین نے بالآخر ان تعصّبات کا خاتمہ کر دیا۔

مس بلیک ویل نے اس سنگین دیوار کے اس مضبوط حصّے پر حملہ کیا جو اس کے ڈاکٹر بننے کے راستے میں حائل تھا۔ رائے عامّہ کی تنگ نظری کے خلاف اس نے جو جہاد کیا وہ پیش قدمی اور اولوالعزمی کا ایک ایسا قصّہ ہے جس کی نظیر مردوں اور عورتوں کے کارناموں میں کم ملے گی۔

الزبتھ بلیک ویل سنہ ۱۸۲۱ء کو پیدا ہوئی۔ اپنی عمر کا ابتدائی زمانہ اس نے انگلستان کے شہر برسٹل میں گزارا جہاں اس کے باپ کا پیشہ شکر سازی تھا۔ وہ نو بھائی بہنوں میں تیسری تھی۔ جب سنہ ۱۸۳۲ء میں اس کے باپ کا دیوالہ نکل گیا تو تلاشِ معاش میں

سارا خاندان امریکہ ہجرت کر گیا۔

اس زمانے میں ترکِ غلامی کی تحریک کی وجہ سے فضا مکدر رہتی ۔ آزادی سے رائیں دی جاتی تھیں اور آپس میں اختلاف شدید تھے ۔ الزبتھ کا باپ سارے خاندان کو ریاست اوہایو کے شہر سنسناٹی لے گیا جہاں وہ چقندر سے شکر بنانے کا کاروبار کرنا چاہتا تھا ۔ لیکن قسمت مہربان نہ ہوئی ۔ آدمی حوصلہ والا تھا مگر کچھ دنوں بعد مر گیا ۔ اب اس کے خاندان کا کوئی آسرا نہ تھا اور اس نئے ملک میں اس کا خاندان اجنبی تھا ۔

بلیک ویل گھرانے پر غربت طاری ہو گئی ۔ تین لڑکیاں جو سب سے بڑی تھیں ، انہوں نے سوچا کہ غریبی کے مقابلے کے لئے کچھ نہ کچھ کام کاج کرنا ہی پڑے گا ۔ جب وہ چھوٹی چھوٹی تھیں اور گھرانا کھاتا پیتا تھا تو گھر پر انہیں استانیاں پڑھاتی تھیں ۔ اب انہوں نے خود استانیاں بننے کا ارادہ کیا ۔ یہ بڑی محنت اور حوصلے کا کام تھا ، مگر وہ اتنا کما لیتیں کہ سر پر چھت کا سایہ قائم رہتا ۔ اتنے میں بھائی جو ان سے عمر میں چھوٹے تھے بڑے ہوتے گئے اور انہوں نے بھی خاندان کی گزر اوقات کے لئے کمانا شروع کر دیا گھریلو اسکول بند کر دیا گیا ۔ اور الزبتھ ضلع کن ٹکی میں ایک اسکول کی صدر استانی بن کے چلی گئی ۔

کن ٹکی کے لوگ اس زمانے میں کاہل اور قدامت پسند تھے ۔ یہ الزبتھ کا ان سے پہلا سابقہ تھا ۔ وہ اس سست روی سے تنگ آ گئی اور پہلے ہی دن جب کہ اونگھتے ہوئے کپتان نے تین میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کشتی چلائی تو اس نے اس کاہلی کے خلاف بغاوت کی ۔ جب وہ اس پھیلے ہوئے ، تاریک ، کتوں سے بھرے ہوئے شہر میں پہنچی تو وہ اور زیادہ جھنجھلائی ۔ لیکن اب بھی اس کی طبیعت میں بڑا جوش تھا ۔ وہاں پہنچ کر پہلے ہی دن اس نے اسکول کھولنا چاہا ۔ شہر کے رہنے والے اس غیر معمولی جوش و خروش کو سمجھ نہ پاتے تھے ۔ "مس بلیک ویل لکھتی ہے " لیکن دوشنبہ

ہی کے دن سے اسکول کھولنا ناممکن تھا۔ وہ لوگ اس خیال کو بڑی نامناسب بات سمجھتے تھے۔ ابھی عمارت ہی کا اچھی طرح انتخاب نہ ہونے پایا تھا، کھڑکیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ فرش اور دیواریں گندی تھیں۔ جگہ جگہ سے پلستر اکھڑ گیا تھا۔ طالبات کو میرے آنے کی اطلاع ہی نہیں تھی۔ انہیں فوراً اسکول کھولنا ناممکن تھا۔ ضروری تھا کہ میں ایک ہفتہ انتظار کروں"۔

لیکن ایک ہفتہ بے کار گزارنا۔ ہفتہ بھر اونگھتے رہنا الزبتھ بلیک ویل کے ذہن کے لئے ناممکن تھا۔ اس نے اتنی ثابت قدمی اور استقلال سے حجت کی کہ شہر کے ذمہ دار لوگوں کا ایک وفد اس سے ملنے آیا۔ ایک حبشی کو بھیج کر اسکول کی عمارت کی کھڑکیاں ٹھیک کرائی گئیں۔ ایک اور کو بھیجا گیا کہ فرش صاف کرے۔ اور خفیف سی امید کی کرن چمکی کہ شاید دوشنبہ ہی کو اسکول کھل جائے۔ لیکن شام کو جب یہ نوجوان استانی اسکول کا کمرہ دیکھنے گئی تو دیکھا کہ سوائے شرارت کے اور کوئی کام نہیں ہُوا تھا "بوڑھے حبشی نے فرش کی کیچڑ پر اور زیادہ پانی انڈیل دیا تھا، اور اسکول کا کمرہ دریائے نیل کا پاٹ معلوم ہوتا تھا" یہ ہفتے کی شام تھی اس کی کوئی امید نہیں تھی کہ اگلے دن یعنی اتوار کو کوئی کام ہو جائیگا۔ اور اسکول سہ شنبہ سے پہلے کھل سکے گا۔ لیکن مس بلیک ویل اپنے ارادے پر اڑی رہی اور کن ٹکی کے ایک ذمہ دار شخص نے اسے بعد میں کہا کہ "کن ٹکی کے ہینڈرسن کے لیئے وہ دوشنبہ ایک تاریخی دن بن گیا"

اس اسکول میں صرف اکیس لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ لیکن اس نوجوان استانی سے لوگ اس قدر متاثر ہوئے کہ بہت جلد لاتعداد لڑکیاں اس اسکول میں پڑھنے لگیں۔ اس نے اپنی بہن کو لکھا "میں ہفتے میں تین دن دس گھنٹے پڑھاتی ہوں۔ کاش میں باقی کے تین دن بھی دس گھنٹے پڑھا سکتی۔ لیکن اتنی محنت کا معاوضہ کم ملتا ہے۔ کاش میں دنیا کے اور کسی حصّے میں ہوتی جہاں کچھ دیر اوروں کو پڑھاتی اور کچھ

دیر خود کچھ پڑھتی اور سیکھتی - یہاں کسی نے کارلائل کا نام تک نہیں سنا ہے - ایمرسن کا نام کسی کے کان تک نہیں پہنچا - اور اگر چیننگ کا ذکر کیا جائے تو یہاں کے لوگ بے ہوش ہو جائیں "

اپنے باپ کی طرح الزبتھ بلیک ویل بھی غلامی کی سخت مخالف تھی - اور اسی لئے وہ یہاں گھرانوں میں غلاموں سے بدسلوکی دیکھ دیکھ کے بہت کڑھتی - اس نے لکھا ہے کہ " شاید میں یہاں غلامی کو بہت نرم شکل میں دیکھتی ہوں - میں نے کسی کو کوڑے لگائے جاتے نہیں دیکھا ، کسی پر شدید ظلم ہوتا نہیں دیکھا - (محض میری خاطر کرنے کے لئے ایک دعوت میں ایک حبشی لڑکی کو میرے اور آتشدان کے درمیان حائل کر دیا گیا تاکہ مجھے زیادہ گرمی نہ لگے) لیکن ایسے انسانوں کے درمیان زندگی بسر کرنا جو صبح سے شام تک لگاتار سخت محنت میں لگے رہتے ہیں - جنہیں ہر شخص گردن میں ہاتھ دے کر دھکیلتا ہے - جو دن بھر گالیاں گھڑکیاں سنتے ہیں - جن کے سر خواہ مخواہ الزام تھوپا جاتا ہے - جن میں اتنی سکت نہیں کہ پلٹ کر جواب دے سکیں - جن کے جذبات کا کسی کو پاس نہیں - جن کو مستقبل کی آس نہیں - جن کے جسم بدبودار ہیں ، بھتنوں کی طرح بدشکل ہیں - ان لوگوں کے درمیان رہنا اور ان کی مدد نہ کر سکنا ، یہ مجھے بڑی ہیبت کی بات معلوم ہوتی ہے اور چاہے کچھ ہو جائے یہاں زیادہ دن نہ رہ سکوں گی "

ان حالات کے باوجود کسی نہ کسی طرح اس کا استقلال ، اس بدمزگی پر حاوی ہو گیا - جس مدت کے لئے وہ آئی تھی - اس نے اسکول میں کام کیا حالانکہ جنوبی ریاستوں کے لوگوں کے خیالات سے اسے اتفاق نہ تھا - لیکن جب وہ بالآخر ایشویل نارتھ کیرولینا میں اپنے گھر واپس پہنچی (جہاں قریب ہی ڈکسن خاندان اور پروفیسر اسٹولین کا دینی مدرسہ چلاتے تھے) تو پھر وہ کسی طرح کنٹکی واپس جانے اور انسانوں کی غلامی کا منظر دیکھنے

پر رضامند نہ ہوئی۔

بہت جلد وہ عورتوں کے حق رائے دہندگی کی تحریک میں سرگرمی سے کام کرنے لگی۔ جب اس نے عورتوں کے حقوق کے لئے جہاد کرنا شروع کیا تو اسے فوراً ہی فیصلہ کرنا پڑا کہ اگر اسے یہ ثابت کرنا ہے کہ ہر ملازمت کے لئے عورتیں بھی اتنی ہی موزوں ہیں جتنے مرد تو اسے خود اس کی زندہ مثال بننا پڑے گا۔ ایک دن اس کی ایک سہیلی نے اتفاقاً ایک جملہ کہہ دیا اور اس سے الزبتھ کی زندگی کا اصل راستہ کھل گیا۔ "تم محنت کرنے کی شوقین ہو۔ صحت مند ہو۔ تمہارے پاس وقت ہے۔ تم ڈاکٹری کیوں نہیں سیکھتیں۔ اگر میرا علاج کوئی لیڈی ڈاکٹر کرے تو میری آدھی بیماری کم ہو جائے۔"

لیڈی ڈاکٹر! اس زمانے میں یہ بڑا انوکھا خیال تھا۔ الزبتھ کو یہ خیال پسند آگیا۔ وہ ہمیشہ بیماری کے نام سے ڈرتی تھی۔ طب کی کسی کتاب کو اٹھا کے دیکھ نہ سکتی تھی۔ لیکن اگر عورت ڈاکٹری کے پیشے کی طرف توجہ کرے تو وہ دنیا کو فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ اور دوسروں کے لئے ایک زندہ نمونہ بن سکتی ہے۔

اس نے جتنے ڈاکٹروں سے اس تجویز کا ذکر کیا ان سب نے کہا یہ خیال تو بہت اچھا ہے۔ مگر اس راستے میں رکاوٹیں ہیں کہ کسی عورت کا ڈاکٹر بننا قریب قریب ناممکن ہے۔

جب لوگ اپنے شک کا اظہار کرتے تو الزبتھ بلیک ویل کہتی "اچھا یہ بات ہے!" وہ خود جہاد کا آغاز کرنے والی تھی۔ اس لئے اس نے تہیہ کیا کہ فوراً ڈاکٹری کی سند حاصل کرنے کے لئے پڑھنا شروع کر دے گی۔ لیکن اس کے لئے پیسہ کہاں سے آئے گا؟ اس کے سارے مشیروں کی رائے تھی کہ طب کی تعلیم

بڑی ھنگی ہوتی ہے۔ بالآخر اس نے طے کیا کہ اسکول میں استانی بن کر پڑھائے اور ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے پیسہ پس انداز کرے۔ بڑی محنت سے اس نے ایسی جگہ کا انتخاب کرنا چاہا جہاں پڑھ بھی سکے پڑھا بھی سکے۔ خوش قسمتی سے اسے شمالی کیرولینا میں ایش ویل میں ایک جگہ مل گئی جہاں کے پرنسپل نے طب میں ڈگری لے رکھی تھی۔ اور اس نے ڈاکٹری میں اسے تھوڑی بہت تعلیم دینے کی حامی بھرلی۔ روز بروز اس کا ارادہ قوی ہوتا گیا کہ خواہ کتنی ہی مخالفت کیوں نہ ہو وہ طب کی سند لے کر رہے گی۔

بالآخر ۱۸۴۷ء میں الزبتھ بلیک ویل فلاڈلفیا جا پہنچی جواب کی طرح اس زمانے میں بھی طبّی تعلیم کا سب سے بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ یہاں ایک خانگی مدرسے میں اس نے تشریح اعضا کا مطالعہ شروع کیا۔ اور اسی زمانے میں میڈیکل کالج میں داخلے کی درخواست دی۔ لیکن کوئی کالج اس کو داخلہ دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ محض اس ضد میں کہ وہ عورت تھی۔ بالآخر ڈاکٹر وارنگٹن نے مایوسی کے عالم میں اسے صلاح دی "الزبتھ۔ یہ بالکل بے کار ہے۔ ان کالجوں میں تمہارا داخلہ نہ ہو پائے گا۔ تمہیں ڈاکٹری کی سند لینی ہے تو مردانہ کپڑے پہن کے پیرس جاؤ۔

اسی خیال کو عملی شکل اس طرح مل گئی کہ فلاڈلفیا کے ایک بڑے طبّی کالج نے جس کو الزبتھ بلیک ویل کی اولوالعزمی سے دلچسپی تھی یہ تجویز کی کہ وہ مردانہ کپڑے پہنے اور کالج میں داخل ہو جائے۔ لیکن الزبتھ بلیک ویل امریکہ میں یا امریکہ سے باہر جھوٹا بھیس بدل کے کالج میں داخل ہونے سے جھجکتی تھی۔ وہ صرف لیڈی ڈاکٹر ہی نہیں بننا چاہتی تھی۔ وہ عورتوں کے حقوق کے لئے بھی جہاد کر رہی تھی۔ اگر وہ کھلّم کھلّا اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی تو اس کی

ساری جد و جہد بے کار تھی۔

امریکہ میں صرف فلاڈلفیا ہی میں تو میڈیکل کالج نہیں تھے۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ کسی نہ کسی ایسے کالج کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے گی جہاں عورتوں کو تعلیم دینے میں تامل نہ ہوگا۔ بالآخر اسے اپنے استقلال کا پھل ملا۔ نیویارک اسٹیٹ کی جینوا یونیورسٹی میں اسے داخلہ مل گیا۔ یہاں ہر ایک اسے دلچسپی کی نظر سے دیکھتا۔ کالج آتے جاتے میں عورتیں اس کا راستہ روک کے اسے گھورتیں جیسے وہ چڑیا گھر کا جانور ہو۔ بعض بیچاری بھلی عورتیں جب اس کے قریب سے ہو کر گزرتیں تو منہ پھیر لیتیں جیسے وہ کوئی چڑیل یا جادوگرنی ہو۔ لیکن کالج کے اندر اسے امن نصیب تھا۔ اور طالب علم اور استاد اس کی ہمّت اور ارادے کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔

بالآخر مس بلیک ویل کو ڈاکٹری کی ڈگری مل ہی گئی۔ اب رائے عامّہ بدلنے لگی۔ جینوا کی عورتوں کو معلوم ہو گیا کہ یہ عجیب عورت جو ڈاکٹر بننا چاہتی ہے نہ پگلی ہے اور نہ آوارہ ہے۔ جب الزبتھ بلیک ویل کو ڈگری دی جانے لگی تو عورتوں کا ہجوم اسے دیکھنے گیا۔ ملک بھر میں یہ خبر چھپی اور سب نے اس عورت کی ہمّت کی داد دی۔

ڈگری لے کے جب الزبتھ فلاڈلفیا واپس پہنچی تو انہی ڈاکٹروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ جو پہلے اپنے کالجوں میں اس کا داخلہ نہیں ہونے دیتے تھے اب وہ لیکچر سنتے اور اسپتالوں کو دیکھنے کے لئے اسے مدعو کرتے۔

لیکن ابھی وہ اپنے کو اس قابل نہ سمجھتی کہ ڈاکٹری شروع کرے، اس لئے وہ اپنی تعلیم کی تکمیل کے لئے یورپ روانہ ہوئی۔ یہاں پھر اسے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں وہ سخت بیمار ہوئی اور اس کی ایک آنکھ کی بصارت جاتی رہی

لیکن اس کی ہمّت اور ارادے میں فرق نہ آیا - وہ دنیا کی پہلی عورت تھی جو سرجن بنی -

پیرس سے فارغ التحصیل ہو کے اس نے کچھ دن لندن میں گزارے وہاں کے اسپتالوں کو دیکھا - یہاں بہت سے لوگ اس کے دوست ہو گئے اور ان کی وجہ سے اس کی زندگی خوش گوار ہو گئی - ان میں فیرے ڈے، لیڈی بائرن، مسز جیمسن، اور فلارنس نائٹینگیل شامل تھے - مس بلیک ویل نے لکھا ہے کہ "مجھ پر فلارنس نائٹینگیل نے یہ راز کھولا کہ طب کا سب سے بڑا مقصد صفائی ہے - صفائی ہی طب کی بنیاد ہے - اور یہی اس کی انتہا ہے" کچھ دنوں اسے یہ خیال ہوا کہ وہ لندن میں مطب کھولے - لیکن وہ دو وجہ سے رک گئی - ایک تو یہ کہ اس کے پاس پیسہ نہ تھا - دوسرے یہ کہ اس کی بہن ایلی نے بھی ڈاکٹری سیکھنی شروع کر دی، اور وہ اپنی بہن کے ساتھ مل کر ایک اسپتال کھولنا چاہتی تھی -

امریکہ واپس آ کے اس نے یونیورسٹی پلیس نیویارک میں اپنا مطب کھولا لیکن اب زندگی کا مرحلہ اور سخت ہو گیا - بہت کم مریض اس کے پاس آتے، دوسرے ڈاکٹر اس سے ملنے جلنے سے پرہیز کرتے اور ڈاکٹروں کی دیکھا دیکھی اور لوگ بھی نہ ملتے - اسے اگر تسلّی ملتی تو صرف اپنے انگریز دوستوں کے ہمدردی اور گرم جوشی کے خطوط سے، جو اس کی ہمّت بڑھاتے رہتے -

تعصّب کی وجہ سے لوگوں نے اس کا بائیکاٹ کر رکھا تھا - وہ اکیلی تھی تنہائی سے بچنے کے لیے اس نے ایک بچے کو پال لیا - اس بچّے کی وجہ سے وہ خلا پر گیا جو اس کی زندگی میں تھا -

۱۸۵۶ء میں بلیک ویل بہنوں نے نیو یارک میں عورتوں اور بچوں کے لئے اسپتال کھولا۔ اس کی بھی اتنی مخالفت ہوئی کہ ابتدا سے پہلے ہی یہ ناکام ہوگیا۔ اس کے لئے روپیہ جمع کرنے کی غرض سے بازار سجائے گئے لکچر دیئے گئے۔ موسیقی کے جلسے کئے گئے۔ لیکن کئی سال تک، یہ دونوں بہنیں کوٹھڑیوں میں سوتی رہیں۔ اور تہ خانوں میں کھانا کھاتی رہیں۔ اور کھانا انہیں کبھی کبھی نصیب ہی نہ ہوتا۔

لیکن بالآخر انہیں کامیابی حاصل ہوئی۔ کیونکہ اب ہر جگہ طالب علم لڑکیاں ترقی اور علم کی جویا تھیں۔ بہت جلد ایک ایسے اسپتال کی ضرورت محسوس ہوئی جہاں لڑکیوں کو نرس اور لیڈی ڈاکٹر بننے کی تعلیم دی جائے۔ جب ابراہم لنکن کے سپاہیوں نے شمال سے دھاوا کیا، اور نرسوں کی ضرورت بڑھ گئی تو دونوں بہنوں نے نرسوں اور حفظانِ صحت کی تنظیم کے لئے ایک انجمن بنائی جس نے اس جنگ کے دوران میں بڑی خدمت انجام دی۔ اب بلیک ویل اسپتال کی بھی قدر بڑھ گئی۔ اور اس میں لڑکیوں کے لئے ایک میڈیکل کالج کا اضافہ ہوگیا۔ یہاں الزبتھ بلیک ویل نے جسمانی صفائی کی تعلیم دینی شروع کی۔ اس نے غریبوں کے گھر گھر پھر کے انہیں صاف رہنے کا درس دیا۔ اس میدان میں بھی اسی نے پہل کی۔

آج بھی بلیک ویل میڈیکل اسکول (راچسٹر نیو یارک) اور جنیوا یونیورسٹی کے "الزبتھ بلیک ویل ہاؤس" کا نام الزبتھ بلیک ویل کے نام کو روشن کر رہا ہے۔ جنیوا یونیورسٹی سے اس نے طب کی ڈگری لی تھی۔ اس کی تصویر لندن کے زنانہ میڈیکل کالج میں آویزاں ہے۔ لیکن اس کا نام اس لئے ہمیشہ عزت کے ساتھ لیا جائے گا کہ اس کی بدولت امریکہ میں اور امریکہ سے باہر عورتوں کے لئے

ڈاکٹری کا پیشہ کھل گیا۔

۱۹۱۰ء میں ۸۹ سال کی عمر میں ڈاکٹر الزبتھ بلیک ویل نے وفات پائی۔ اپنی اس طویل عمر میں اس نے بہت سے ان مقاصد کو پورا ہوتے دیکھا جن کے لیئے اس نے جدوجہد کی تھی۔ وہ دنیا کی پہلی عورت تھی جو ناقابلِ عبور دشواریوں سے گزر کر ڈاکٹر اور سرجن بنی۔ اپنی زندگی میں اس نے یہ دیکھ لیا کہ مزید عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش اسپتالوں اور تجربہ خانوں میں ڈاکٹروں کی حیثیت سے کام کرنے لگیں۔

روزا بونیر

مُصوّرہ

سنہ ۱۸۲۲ء تا سنہ ۱۸۹۹ء

سنہ ۱۸۷۰ء کی جنگ میں جب پرشیا نے فرانس پر فتح پائی اور پرشیا کی فوجیں نونٹین بلُو کے قصبے میں داخل ہوئیں تو انہیں یہ حکم ملا کہ روزا بونیر کے مکان اور اس کی تصویروں کی حفاظت کی جائے۔ فوجوں نے قصبے کو تہس نہس کر ڈالا لیکن شاتوبی جو اس مصوّرہ کا مکان تھا بالکل محفوظ رہا۔ اگر فوج کو یہ حکم نہ ملتا تو ممکن تھا کہ دنیا اس مصوّرہ کی بہت سی تصویروں سے محروم ہو جاتی۔

روزا بونیر پیرس میں سنہ ۱۸۲۲ء میں پیدا ہوئی۔ اس کا باپ خداداد استعداد رکھتا تھا۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ استعداد رکھنے والے دنیا میں پھلنے پھولنے نہیں پاتے۔ اس لئے وہ ڈرائنگ سکھا کے اپنے بچّوں کا پیٹ پالتا تھا۔ ماں گھر گھر پھر کے دن بھر پیانو بجانا سکھایا کرتی۔ پیرس میں سیدھا سادا سا گھر چلانا اور چاروں بچّوں کو پیٹ بھر کھلانا بڑا مشکل کام تھا۔ سنہ ۱۸۳۳ء میں تھکن اور غربت سے چُور چُور ہو کے بچاری ماں مر گئی۔

تینوں بڑے بچّے جن میں روزا بھی شامل تھی ثناں زلینرے کے ایک رہائشی مکتب میں بھیج دیئے گئے۔ جس کی نگرانی ایک عورت کرتی تھی جو اماں کیتھرین کہلاتی تھی۔ سب سے چھوٹے بچّے کو رشتہ داروں کے پاس بھیج دیا گیا۔ دو سال تک اماں کیتھرین بچّوں کی نگرانی کرتی رہی۔ انہیں اسکول بھیجتی رہی اور انہیں اپنے بچّوں

کی طرح پالتی رہی۔ لیکن روزا اس کے لئے ایک مسئلہ تھی۔ وہ ضد کر کے گوادے بوتون میں پھول جمع کرتی اور کھیلتی رہتی، باہر کے منظر سے لطف اٹھاتی اور اسکول جانے کا نام نہ لیتی۔ روزا نے خود اپنے زمانے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے "اس دو سال کے عرصے میں جب کبھی موسم خوشگوار ہوتا میں گھنٹہ بھر بھی گھر کے اندر نہ ٹھہرتی"

بالآخر باپ نے دوسری شادی کی اور بچوں کو واپس بلا لیا۔ دونوں لڑکے آگسٹ اور اسادور اسکول میں داخل ہو گئے۔ اور ان کا خرچ برداشت کرنے کے لئے روزا کا باپ میبو بونیر اسی اسکول میں ہفتے میں تین بار ڈرائنگ سکھاتا چونکہ روزا کو اسکول سے دلچسپی نہ تھی۔ اس کے باپ نے اسے کوئی اور کار آمد ہنر سکھانا چاہا۔ اس لئے طے یہ کیا کہ اسے سینا پرونا سکھایا جائے۔

لیکن اس لڑکی کو سینا پرونا بھی اسکول کے بند کمرے کی طرح ناپسند تھا۔ وہ تو باہر نکل کے پھول چننا جانتی تھی۔ اسے باہر نکلنے کی اتنی تمنا تھی کہ اسکول میں گھٹی گھٹی رہتی۔ چنانچہ اسے مجبوراً گھر بھیج دیا گیا۔ اس کا باپ پریشان ہو گیا اس نے اس لڑکی کو جو پیچیدہ مسئلہ بن گئی تھی ایسے ہی ایک اسکول میں داخل کرانا چاہا جس طرح کے اسکول میں اس کے دونوں لڑکے پڑھتے تھے۔ اس نئے اسکول میں جو نوبرگ سال آن توان میں واقع تھا۔ روزا اپنے اسکول کی ساتھیوں میں بڑی مقبول ہو گئی۔ کیونکہ وہ اپنی استانیوں کی بڑی بڑی مضحکہ خیز تصویریں بناتی تھی۔ استانیوں کو خود اپنی اس طرح کی بگڑی ہوئی تصویریں دیکھ کے غصہ آتا لیکن اس لڑکی کی جودت طبع اور ان تصویروں کی جولانی دیکھ کر وہ بھی داد دیئے بغیر نہ رہ سکتیں۔ ان استانیوں نے ان تصویروں کو ایک البم میں لگا کر رکھا۔

لیکن روزا خوش نہیں تھی۔ فطرتاً وہ بڑی حسّاس واقع ہوئی تھی۔ اسکول

کی سختیوں اور پابندیوں سے اس کا دل بغاوت کرتا۔ وہ اپنی ہم جماعت لڑکیوں کے ریشمی لباس کو دیکھتی اور اپنے موٹے جھوٹے لباس سے مقابلہ کر کے کڑھتی، وہ لوہے کے چمچے سے کھانا کھاتی۔ اس کا پیالہ ٹین کا تھا۔ لیکن اس کی سہیلیوں کے پاس چاندی کے برتن تھے۔ وہ پہلے کڑھتی اور شرماتی۔ پھر اداس اداس اور بے چین رہنے لگی، غربت کی وجہ سے اس کے احساسِ کمتری نے اسے اتنا تنگ کیا کہ وہ بیمار پڑ گئی اور اسے گھر بھیج دینا پڑا۔

اب اس کے باپ نے اسے تعلیم دلانے کی تجویز ترک کر دی اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اب روزا نے اپنے باپ کے اسٹوڈیو میں زیادہ آنا جانا شروع کیا۔ اپنے باپ کی طرح، اس نے بھی خاکے کھینچنے شروع کئے۔ وہ مٹی سے بت بناتی اور اپنے باپ کی تصویروں کی نقل کرتی۔ اس کی ساری اداسی رفع ہو گئی۔

میو بونیر کو دفعتاً اس کا احساس ہوا کہ اس کی بیٹی نے مصوری کی خداداد استعداد پائی ہے۔ اس نے اسے بڑی احتیاط سے مصوری سکھانی شروع کی۔ پھر اس نے اسے لوور کے مشہور عالم تصویر خانے میں بھیجا کہ وہاں دنیا کے مشہور مصوروں کی تصویروں کی نقل کرے۔ یہاں اس نے بڑی جانفشانی سے محنت کی۔ لوور کا ڈائرکٹر اس کو اس طرح محنت کرتے دیکھ کے کہتا "میں نے بہت کم کسی کو اتنے جوش اور خلوص سے محنت کرتے دیکھا ہے۔"

ایک روز ایک انگریز نے اس کے تختۂ تصویر کے قریب ٹھہر کے اس کی ہمت افزائی کی۔ "میری بیٹی تم بہت اچھی نقل اتار لیتی ہو۔ جم کے محنت کرتی رہو ایک دن تم بہت بڑی مصور بن جاؤ گی۔" ان الفاظ سے اس کی ہمت اور بڑھ گئی۔ اس دن جب وہ گھر گئی تو اسے اسکول کے دنوں کی قسم یاد آ گئی جب کہ

وہ لوہے کے چمچے سے کھانا کھاتی تھی اور سوچتی تھی کہ ایک دن میں اپنی ہم جماعتوں کی طرح امیر اور خوش قسمت بن کے رہوں گی۔

روزا بونیر نے قدیم مصوروں کی تصویروں کی جو نقلیں بنائیں وہ جلد بک گئیں ان سے تھوڑی بہت آمدنی ہوئی۔ یہ سارا پیسہ روزا نے بڑی خوشی سے اپنے والد کے حوالے کر دیا۔ کیونکہ اس کے باپ کو اب روپے کی اور زیادہ حاجت تھی، دوسری بیوی سے دو بچے اور تھے۔ ایک اور ابھی پیدا ہوا تھا جس کا نام ژردین تھا۔ روزا کی کمائی کی کوڑی کوڑی سات بچوں کے خاندان پر خرچ ہو جاتی۔

اب روزا کی عمر سترہ سال کی ہو گئی تھی۔ اسے منظر کشی اور تاریخی تصویریں اتارنا پسند تھیں۔ لیکن ایک دن اس نے ایک بکری کی تصویر اتاری۔ یہ اسے اتنی پسند آئی کہ آئندہ جانوروں کی تصویر کشی کو اس نے اپنا خاص مشغلہ بنا لیا۔ اس کے پاس اتنے پیسے تو تھے نہیں کہ نمونہ کے لئے جانور خریدتی یا کرائے پر لیتی۔ اس لئے وہ پیدل دور تک آبادی سے باہر نکل جاتی اور کسانوں کے مزرعوں میں جانوروں کو دیکھ دیکھ کے ان کی تصویریں بناتی۔ جیب میں روٹی رکھ کے لے جاتی مگر وہاں پہنچ کے روٹی کھانا بھول جاتی۔ سارا دن محنت کر کے شام کو گھر واپس آتی۔ اکثر وہ بارش میں بھیگ جاتی اور اس کے جوتے کیچڑ میں لت پت ہوتے۔

بہت جلد روزا نے جانوروں کے مطالعے کا ایک سہل ذریعہ ڈھونڈھ نکالا پیرس کی نواح میں جانوروں کے مذبح تھے۔ یہ نوجوان لڑکی جانوروں کو ذبح ہوتا ہوا دیکھنا پسند نہ کرتی تھی۔ پھر بھی وہ جانوروں کے مطالعے کے لئے وہاں جاتی وہ جی کڑا کر کے جانوروں کو ذبح ہوتا ہوا دیکھتی تاکہ ان کی مرتے دم کی تڑپ کو تصویر کی شکل دے سکے۔ وہ کھلیان پر بیٹھ جاتی اور قصائی اور چرواہے جمع ہو کے

دیکھتے کہ کس طرح اس کے مُوقلم سے تصویریں بنتی چلی جاتی ہیں۔

اس درمیان میں بونیر خاندان ریور منوئٹ میں ایک چھوٹے سے مکان کی چھٹی منزل میں منتقل ہو گیا تھا۔ دونوں لڑکے آگسٹ اور اسادور آرٹسٹ بن گئے تھے۔ ایک مصوّر تھا اور دوسرا سنگتراش۔ روزا دن بھر تصویریں کھینچتی۔ شام کو دوکانداروں کے لئے کتابوں کی تصویریں بناتی یا جانوروں کے ننھّے ننھّے مجسمے بناتی۔ غربت کے باوجود یہ خاندان خوش تھا۔ کیونکہ اب انہیں تخلیقی کام کرنے کی فرصت تھی۔

مکان کی چھت پر روزا نے رنگ برنگ کے پھولوں کا ایک باغیچہ بنا لیا تھا، یہاں انہوں نے تصویروں کا نمونہ بنانے کے لئے ایک بھیڑ پال رکھی تھی جس کی اون بڑی بڑی اور ریشمیں تھی۔ اس کا بھائی اسادور اس بھیڑ کو اپنی پیٹھ پر لاد کے سیڑھیوں سے نیچے اتار لاتا تاکہ وہ گھاس چر سکے۔ اور پھر چھ منزل اوپر اٹھا لے جاتا۔

جب روزا ۲۳ اُنیس سال کی ہوئی تو اس نے اپنی تصویریں دنیا کے سامنے پیش کرنے کی، اور نقادوں سے تنقید سننے کی جرأت کی۔ اس نے اپنی دو تصویریں "بکریاں اور بھیڑیں" اور "دو خرگوش" فنونِ لطیفہ کی نمائش میں بھیجیں۔ لوگ بہت خوش ہوئے۔ اور تنقید نگاروں نے اتنی سخت تنقید نہیں کی۔ جتنی اس کو توقع تھی! دوسرے سال اس کی تصویریں "چراگاہ میں جانور"، "سبزہ زار میں ایک گائے"، "بکنے والا گھوڑا" نمائش میں پیش ہوئیں اور لوگوں نے انہیں پسند کیا۔ دو سال بعد روزا نے بارہ تصویریں نمائش میں بھیجیں۔ اس کی تصویروں کی دونوں جانب اس کے باپ اور اس کے بھائی کی بنائی ہوئی تصویریں آویزاں کی گئیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ان دونوں کی تصویریں بھی نمائش کے لئے قبول کی گئیں۔ تنقید نگار روز بروز اس کے کام کی زیادہ تعریف کرنے لگے۔ اور وہ جنگ زیادہ سخت نہ رہی جو روزا

اب تک غربت کے خلاف لڑ رہی تھی۔

۱۸۴۸ء میں جب روزا ستائیس سال کی تھی اسے حقیقی کامیابی نصیب ہوئی اس کی ایک بے مثل تصویر پر اسے طلائی تمغہ دیا گیا۔ اور اسے انگلستان کی حکومت نے خرید لیا۔ انعام دینے والی کمیٹی کے صدر نے بہت بڑے مجمع کے سامنے روزا بونیر کو تحفہ دیا۔ اور اس کے علاوہ فرانس کی حکومت کی جانب سے سیور کا بنا ہوا ایک بڑا خوبصورت گلدان عطا کیا۔

روزا کی طرح اس کے خاندان کے بھی دن پھر گئے۔ میسو بونیر کو لڑکیوں کے ڈیزائن بنانے کے مدرسے کا صدر مقرر کیا گیا۔ لیکن غربت سے چھٹکارا حاصل بھی ہوا تو آخر وقت۔ کیونکہ اسی سال ریمنڈ بونیر کا انتقال ہو گیا۔ روزا نے اس کے متعلق لکھا ہے "اس کا تخیل عظیم تھا، لیکن اسے ہم لوگوں کو پالنے کے لئے تعلیم و تدریس کا کام کرنا پڑا۔ اسی میں اس کا وقت گذر گیا۔ اسے مہلت ملی ہوتی تو دوسرے بڑے مصوروں کی طرح اس کا نام بھی زندہ جاوید ہو جاتا۔"

اپنے باپ کی جگہ روزا اس مدرسے کی صدر مقرر ہوئی اور اس کی بہن جولیٹ بھی اسی مدرسے میں پڑھانے لگی۔ اسی سال روزا کی وہ مشہور تصویر جو اب لکسم بورگ کی گیلری میں ہے تیار ہوئی۔ اس کا نام ہے "نروین میں ہل چلانے کا منظر" اب روزا کے پاس تصویروں کی بہت سی فرمائشیں آنے لگیں لیکن آدھی فرمائشوں کی تکمیل کا بھی اسے وقت نہ ملتا۔

چار سال بعد اٹھارہ مہینے کی سخت محنت اور کاوش کے بعد اس کی سب سے مشہور تصویر "گھوڑوں کا میلہ" تیار ہوئی اور نمائش کے لئے پیش ہوئی اس تصویر کی نہ صرف فرانس بلکہ انگلستان اور امریکہ میں بھی خوب داد دی گئی۔ ایک انگریز نے اسے آٹھ ہزار ڈالر میں خریدا۔ پھر نیویارک کے

مسٹر اے۔ ٹی۔ اسٹوارٹ نے اسے اپنے مشہور نگار خانے کے لئے خریدا۔ بالآخر یہ نیویارک کے میٹروپولیٹن میوزیم آف آرٹ کو تحفتاً پیش کی گئی۔

یہ تصویر اس قدر مقبول ہوئی کہ نپولین سوم کے مشیروں نے اسے مشورہ دیا کہ اسے فرانس کا سب سے بڑا اعزازی تمغہ (لیجن آف آنر کی صلیب) عطا کیا جائے۔ اگرچہ وہ تیری میں اس سرکاری ڈنر میں بلائی گئی جس میں فنونِ لطیفہ کی اکادمی کے اعلےٰ ترین اعزاز پانے والوں کو مدعو کیا جاتا ہے لیکن نپولین سوم کو ہمت نہ ہوئی کہ لیجن آف آنر کی صلیب ایک عورت کو عطا کرے۔ اس کا خیال تھا کہ رائے عامہ اس کو پسند نہ کرے گی، اور اسے ہمیشہ اپنا تخت کھو دینے کا ڈر لگا رہتا تھا۔

لیکن روزا بونیر کو یہ گرانقدر تمغہ مل ہی گیا۔ ہنری بیکن نے رسالہ "سنچری" میں بیان کیا ہے کہ یہ تمغہ کس طرح دیا گیا۔ "شہنشاہ نپولین سوم ۱۸۶۵ء کے موسم گرما میں تھوڑے عرصے کے لئے پیرس سے باہر چھٹیاں منانے گیا ہوا تھا اور اس نے اپنی جگہ اپنی ملکہ کو اپنا جانشین بنا دیا تھا۔ فونتین بلو کے شاہی قصر سے روزا بونیر کا مکان شاتو بی قریب ہی تھا۔ جب ملکہ روزا کے اسٹوڈیو میں داخل ہوئی تو وہ کام میں مصروف تھی۔ ملکہ نے اسے لپٹا لیا اور اسے پیار کیا، یہ ملاقات چند ہی لمحوں کے لئے تھی۔ ملکہ جس تیزی سے آئی تھی اسی تیزی سے چلی گئی۔ اس کی سواری اور چابکوں کی آواز آئی اور پھر سناٹا ہو گیا۔ اس کے بعد روزا کو پتہ چلا کہ جب ملکہ نے اسے لپٹا کے پیار کیا تھا اسی وقت اس کے بلاؤز میں لیجن آف آنر کی صلیب بھی لگا گئی تھی۔"

اپنی عمر کے آخری حصے میں روزا کو شاہ بلجیم نے اعزازی صلیب کا تحفہ عطا کیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ یہ اعزاز ایک عورت کو عطا کیا گیا تھا۔ اسپین کے بادشاہ

نے بھی اس کے کام کی قدردانی کے طور پر اسے ایک اعزازی نشان عطا کیا۔

جس زمانے میں روزا "گھوڑوں کا میلہ" اور دوسرے شاہکار تیار کر رہی تھی اسے اپنے کاروبار کی وجہ سے مردوں سے اس قدر سابقہ پڑتا کہ اس نے مردوں جیسے کپڑے پہننے شروع کر دیئے۔ اس عجیب لباس کی وجہ سے بعض بڑے دلچسپ واقعات پیش آنے لگے۔ ایک واقعہ جس کا روزا کے دوستوں نے ذکر کیا ہے یہ ہے کہ جب وہ دیہات سے شہر واپس آئی تو اسے اپنی ایک سہیلی کی علالت کی اطلاع ملی۔ وہ کپڑے بدلے بغیر مردانہ لباس میں اسے دیکھنے چلی گئی۔ اور اپنی سہیلی کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ جب ڈاکٹر آیا تو یہ سمجھا کہ کوئی نوجوان اس کی مریضہ کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ وہ احتیاطاً الٹے پاؤں واپس چلا گیا۔ اس کی بیمار سہیلی نے چیخ کر کہا "جلدی سے اسے بلا لاؤ۔ وہ یہ سمجھ کر کہ تم میری عاشق ہو الٹے پاؤں واپس چلا گیا۔ اور مجھے مرنے کے لئے چھوڑ گیا۔ روزا جھپٹ کے نیچے اتری اور ڈاکٹر کو بلا لائی۔

مردانہ لباس روزا کو اس قدر راس آیا کہ اس نے اپنی عمر کا زیادہ حصّہ اسی لباس میں گزار دیا۔ یہی لباس پہن کے اس نے تصویریں اتارنے اور خاکے بنانے کے لئے اسکاچستان کے پہاڑوں اور کوہ پیرے نیز سے ہو کر اسپین کا سفر کیا۔ اس کی سہیلی مدموزیل مکاس ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ رہتی۔ یہ بھی ایک فن کار تھی۔ گو روزا بونیر کے برابر مشہور نہ تھی۔

پیرے نیز میں یہ دونوں سہیلیاں ایسے غیر آباد علاقے سے ہو کر گزریں کہ کبھی کبھی چھ چھ ہفتے تک خچروں اور خچر سواروں کے سوا انہیں کوئی نظر نہ آتا۔ ایک بار یہ ہوا کہ روزا اور مدموزیل مکاس کو فاقوں کی نوبت آ گئی اور انہوں نے مینڈک پکڑ پکڑ کے ان کی اگلی ٹانگیں بھون بھون کے کھانا شروع کر دیں

دو دن تک ان کی یہی غذا رہی۔

اسکاٹ لینڈ میں اس مصورہ نے اپنی حسب ذیل تصویریں بنائیں:۔
"پہاڑی لوگ" "ہائی لینڈ کی بلندیوں میں صبح کا منظر" "ہائی لینڈ میں ایک جھیل کے پار"۔
وہ جہاں جاتی اس کی مدارات شاہی مہمان کی سی ہوتی۔ سر ایڈون لینڈ سیر جو خود بھی مصور تھا اور جس کے متعلق روزا نے پیشین گوئی کی تھی کہ وہ اس سے شادی کرے گی اس کی بے مثل تصویر "گھوڑوں کا میلہ" دیکھ کے کہہ اٹھا "یہ تصویر میرے ہنر سے بازی لے گئی۔ حالانکہ عورت سے ہار ماننا برا معلوم ہوتا ہے۔"

کئی سال روزا پیرس میں ریو داساس میں مقیم رہی۔ یہاں اس کے پاس بڑا خوبصورت اسٹوڈیو تھا۔ اسٹوڈیو کی چھت میں روشنی کا انتظام تھا۔ دیواروں پر تصویریں تھیں۔ اور فرش پر پرانے ہتھیار، قالین۔ ٹوپیاں۔ لبادے اور شیروں، چیتوں اور لومڑیوں کی کھالیں بکھری پڑی رہتیں۔ جمعہ کی سہ پہر کو اسٹوڈیو میں اس کے دوستوں کی عام دعوت ہوتی۔ جو کچھ عرصہ کے لئے ضرور آ جاتے۔ اور اس عجیب و غریب کمرے میں آرام لیتے۔ روزا خود تصویریں بنانے میں مشغول رہتی۔

کئی سال تک روزا فونتین بلو کے قریب شاتو بی میں مقیم رہی۔ یہ قلعہ لوئی پانزدہم کے زمانے کا بنا ہوا تھا۔ ہنری بکن نے اس کا بڑے دلچسپ الفاظ میں ذکر کیا ہے۔
"صدر دروازہ تو آہنی چولوں پر گھومتا ہے اور اس میں لکڑی کی کھڑکیاں ہیں۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا سا دروازہ ہے جس میں خانقاہوں کے دروازوں کی ایک کھڑکی ہے، دروازوں تک جانے کے راستے بالعموم بند رہتے ہیں۔ باہر کی دنیا سے جب کسی کو بلانا ہوتا ہے تو روزا گھنٹی بجاتی ہے۔ گھنٹی کا دوسرا سرا پھاٹک کے قریب ہے جب گھنٹی بجتی ہے تو بے شمار کتے بھونکنے لگتے ہیں۔ طرح طرح کے کتے طرح طرح کی بولیاں بولتے ہیں۔ جب کتوں کی پہلی سنگیت ختم ہو جاتی ہے تو ایک چھوٹا سا گھوڑا

کُتا باہر آ کے بھونکنے لگتا ہے۔ اور یہ سنگیت پھر سے شروع ہوتی ہے۔ اس درمیان میں پنجروں میں جو شہباز اور طوطے بند ہیں وہ بھی اسٹوڈیو کے کونے میں جاگ پڑتے ہیں۔ اور وہ بھی اس سنگیت میں شریک ہو جاتے ہیں۔

مکان کے پیچھے ایک بڑا سا باغ ہے، اس کے بعد ایک اونچی سی دیوار ہے اور پھر جنگل۔ قریب ہی سبزے کا چمن اور پھولوں کے تختے ہیں۔ موسم اچھا ہوتا ہے تو سبزے کے چمن میں ایک بیل اور ایک گائے چرتے نظر آتے ہیں۔ یہ روزا کی تصویروں میں نمونوں کا کام دیتے ہیں۔ ایک تار کے کٹہرے میں پیرے نیز سے لائے ہوئے دو یورپی سانبھر اور مکان سے ذرا زیادہ دور کٹہرے میں بھیڑیں اور ہرن ہیں۔

اسٹوڈیو بہت عریض ہے۔ اس کے ایک سرے پر بڑا سا آتشدان ہے۔ جسکے ستونوں کی تہہ میں اسادور بونیر کے تراشے ہوئے دو اصل قد و قامت کے کتے ہیں۔ آتشدان کے دونوں جانب روزا بونیر کے باپ اور ماں کی تصویریں ہیں۔ کمرہ جانوروں کے بھرے ہوئے سروں سے آراستہ ہے اور چڑیاں جہاں موقع ملتا ہے بسیرا لیتی پھرتی ہیں۔

اس عجیب ماحول میں اس مصورہ نے کئی سال کام کیا یہاں تک کہ مئی ۱۸۹۹ء میں ۷۷ سال کی عمر میں اس نے وفات پائی۔ اور اپنی عظیم الشان تصویریں اپنی یادگار چھوڑ گئی ؛

ماری کیوری

سائنس داں

سنہ ۱۸۶۷ء تا سنہ ۱۹۳۴ء

"ماری کیوری کی زندگی ایسے حیرت انگیز کارناموں سے لبریز ہے کہ اس کی زندگی کی کہانی ایک ہوش ربا داستان معلوم ہوتی ہے"۔ ان الفاظ میں ایو کیوری نے اپنی نامور والدہ کی سوانحعمری میں اپنی والدہ کا ذکر کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ماری کیوری سائنس کے میدان میں ایک بڑا غیر معمولی دماغ رکھنے والی عورت تھی۔ اس ذہن و دماغ کے ساتھ ساتھ اسے سعی و استقلال کی بے پناہ صلاحیت عطا ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے اس نے ریڈیم دریافت کیا۔ یہ وہ بیش بہا چیز ہے۔ جس کی دریافت کی وجہ سے مادام کیوری کا دنیا پر ہمیشہ احسان رہے گا۔

مانیا اسکلودوسکا جو آگے چل کے ماری کیوری کے نام سے مشہور ہوئی پولینڈ کے شہر وارسا میں ۷ نومبر سنہ ۱۸۹۷ء کو پیدا ہوئی اس کی ماں اسے چھوڑ کر چل بسی اور اس کے باپ نے جو طبیعات و ریاضی کا استاد تھا اس کی پرورش کی۔ اپنے باپ کے تجربہ خانے میں مانیا سائنس سے روشناس ہوئی۔ وہ ابھی ننھی سی تھی کہ تجربہ گاہ کے کمروں میں ادھر ادھر پھرتی اور سائنس کے آلوں کو حیرت سے دیکھتی۔

یہ پولینڈ میں مصیبت کا زمانہ تھا۔ سنہ ۱۸۶۱ء میں روسیوں نے ملک کو فتح کر لیا تھا، اسکولوں میں روسی کے سوا اور کوئی زبان نہ پڑھائی جاتی تھی۔ نہ اس کی اجازت تھی کہ اس زمانے کا ذکر کیا جائے جب پولینڈ آزاد تھا۔ اگر کوئی ایسی غلطی کرتا تو اسے سائبیر

کی ویران سرزمین میں جلاوطن کر دیا جاتا۔ لیکن اسکلودوسکا گھرانے میں پولش زبان ہی ہمیشہ بولی جاتی تھی۔ شام کے وقت پروفیسر بلند آواز سے پولش شاعری پڑھتا اور موسم گرما کی چھٹیوں میں وہ اپنے خاندان کو پولینڈ کے جنوبی صوبوں میں لے جاتا جہاں آسٹریا کی حکومت تھی۔ اور یہ حکومت زیادہ فراخ دل تھی۔ یہاں بچے کھیتوں میں کھیلتے پھرتے اور گرفتاری کے اندیشے کے بغیر اپنی مادری زبان میں چلّا چلّا کے باتیں کرتے۔

مانیا ابھی چار ہی سال کی تھی کہ اس کی غیر معمولی ذہانت کا ثبوت ملا۔ گرمیوں کے دنوں میں اس کی بڑی بہن برونیا نے جو اکیلی سارے حروف تہجّی یاد کرنے سے گھبراتی تھی، سوچا کہ وہ خود استانی بن جائے اور مانیا کو اپنی شاگرد بنائے۔ اس طرح دونوں حروف پہچاننے لگیں گی۔ کچھ ہفتوں تک دونوں ننھی لڑکیاں یہ تجربہ کرتی رہیں۔ اور دفتی سے کاٹ کاٹ کے حروف بناتی رہیں۔ یہ تفریحی مشق بڑی کامیاب ثابت ہوئی کیونکہ ایک روز صبح کو جب برونیا ایک معمولی سا سبق دہرانے میں غلطیاں کر رہی تھی۔ تو مانیا سے صبر نہ ہو سکا۔ اس نے اپنی بہن کے ہاتھ سے کتاب کھینچ کے پڑھنا شروع کیا۔ سارا اسکلودوسکا خاندان سکتے کے عالم میں دیکھتا رہ گیا۔ ان کی اس توجہ سے مانیا بہت خوش ہوئی اور پڑھتی چلی گئی۔ خود بخود حروف جڑ کے لفظ بنتے چلے گئے۔ جب اس نے سر اٹھایا تو دیکھا کہ اس کا باپ مبہوت کھڑا ہے۔ اس کی تینوں بہنوں اور اس کے بھائی کے منہ فرطِ حیرت سے ویسے ہی کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اسے بڑا ڈر معلوم ہوا وہ رونے لگی اور روتے میں کہنے لگی "مجھے معاف کیجئے۔ معاف کیجئے۔ یہ میری غلطی نہیں۔ میں نے عمداً نہیں پڑھا۔ نہ یہ برونیا کی غلطی ہے۔ یہ اتنا آسان ہے۔"

سولہ سال کی عمر میں مانیا نے گورنمنٹ اسکول سے اعزاز کے ساتھ میٹرک

پاس کیا۔ مانیا کی بڑی تمنا تھی کہ پیرس جا کے ساربون یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرے لیکن خاندان کی مالی حالت ٹھیک نہیں تھی اور برونیا جو اس سے تین سال بڑی تھی میڈیکل اسکول میں داخلے کا انتظار کر رہی تھی۔ مانیا نے اپنی چہیتی بہن کی ہمت افزائی کی اور کہا کہ میں نوکری کروں گی اور اپنی تنخواہ کا تھوڑا حصہ تمہیں دوں گی۔ تاکہ تم اپنی خواہش کے مطابق طبی تعلیم حاصل کر سکو۔ مانیا کی تجویز یہ تھی کہ وارسا کے مفت تعلیم دینے والے اسکولوں سے کسی ایک میں نوکری کرلے۔ مگر اسے کہیں نوکری نہیں ملی۔ بالآخر اس نے سوچا کہ کسی گھرانے میں بچوں کی استانی بن کے نوکر ہو جائے۔ وارسا کے باہر ایک معزز گھرانے میں اسے نوکری مل گئی۔

تھوڑے ہی دنوں میں یہ خاندان اپنی اس نئی استانی سے بہت شفقت اور محبّت سے پیش آنے لگا۔ اس کے عادات و اطوار شائستہ تھے۔ وہ ذہین تھی حاضر جواب تھی۔ اور بے حد حسین تھی۔ جب اس خاندان کا فرزندِ اکبر کاسمیر وارسا سے چھٹیاں گزارنے گھر آیا تو اس نے دیکھا کہ یہ بے نظیر لڑکی اس کے گھر میں استانی کی خدمت پر مامور ہے اور یہ اس سے محبّت کرنے لگا۔ مانیا کی بھی اس سے محبّت کرنے لگی۔ اور دونوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہیں اس کی توقع نہ تھی کہ خاندان کی طرف سے مخالفت ہوگی۔ کیونکہ سب لوگ مانیا کو بہت چاہتے تھے۔ اس لیے بڑے اطمینان سے کاسمیر نے اپنے والدین سے اپنی شادی کے ارادے کا ذکر کیا لیکن فوراً ہی خاندانی تعصّبات سدِّ راہ بن کر حائل ہو گئے یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ متموّل اور معزز خاندان کا فرزندِ اکبر ایک مفلس اور قلّاش لڑکی سے شادی کرلے۔ کاسمیر نوعمر تھا اور اس میں اتنی ہمّت اور اتنا کردار نہیں تھا کہ وہ والدین کی مخالفت کی پروا نہ کرتا۔ وہ ہمّت ہار گیا اور مانیا نے صبر کر لیا۔ وہ ضرورت مند ہونے کی وجہ سے اسی گھرانے میں نوکری کرتی رہی لیکن اس

جگہ اب وہ خوش نہ تھی۔

تین سال اس گھر میں اتالیق کی حیثیت سے گزار کے وہ وارسا اپنے گھر واپس آگئی۔ یہ اس کا اپنا پرانا اور پیارا گھر تھا۔ یہاں اس کا باپ اس کی پریشانیوں کو سمجھ سکتا تھا اور محبت اور ہمدردی سے اس کی ہمت بڑھا سکتا تھا۔ اس نے بڑی کفایت شعاری سے اپنی نوکری کے زمانے میں پیسہ پیسہ جوڑا تھا کہ کسی کالج میں اپنی تعلیم مکمل کر سکے۔ لیکن کالج کی تعلیم مہنگی تھی، اتالیق گیری کی قلیل تنخواہ سے جو بچت ہوئی تھی وہ اتنی نہیں تھی کہ اس سے وہ کالج کی تعلیم جاری رکھ سکے۔ لیکن اب برونیا اس کے کام آئی، برونیا نے پیرس میں ایک نوجوان ڈاکٹر سے شادی کر لی تھی۔ اور اس کا گھر ساربون کے قریب ہی تھا۔ جہاں اس نے مانیا کو بلا بھیجا۔ مارچ ۱۸۹۰ء کو اسے فرانس سے ایک خط ملا۔ جسے پڑھ کر مانیا کا دل باغ باغ ہو گیا۔ خط میں یہ فقرے بھی درج تھے :۔

"اور اب تم میری ننھی مانیا، تمہیں بھی تو اپنی زندگی کو تھوڑا بہت سنوارنا ہے۔ اگر تم چند سو روبل جمع کر سکو تو آئندہ سال پیرس آ جاؤ۔ ہمارے گھر میں ہمارے ساتھ رہو۔ جہاں تمہارے کھانے اور رہنے کا انتظام تو ہو ہی جائے گا۔ ساربون کی فیس کے لئے چند سو روبل فراہم ہونا ضروری ہے۔ پہلے سال تم ہمارے ساتھ رہو گی۔ دوسرے اور تیسرے سال جب ہم یہاں نہ رہیں گے (ہمارا وارسا واپس آنے کا ارادہ ہے)، میں قسم کھاتی ہوں والد کو مجبور کروں گی کہ وہ تمہاری مدد کریں۔ اس کا جلد فیصلہ کر لو۔ تم نے بہت دن انتظار کر لیا۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں تم دو سال میں

ایم۔ اے کرلوگی۔ جلدی سے روپیہ جمع کرلو۔ اسے حفاظت سے رکھو اور کسی کو قرض نہ دو۔"

اس خط کے آنے کے سال بھر بعد تک مانیا اپنے والد کے ساتھ وارسا ہی میں رہی اور پیسے بچاتی رہی۔ وہ گھر چلاتی۔ کچھ لڑکیوں کو پڑھاتی اور خود کئی گھنٹے روز پڑھتی۔ اس کی رشتے کی بہنیں ایک چھوٹے سے تجربہ خانہ کو چلا رہی تھیں۔ یہاں وہ اپنے باپ کی نگرانی میں کیمیاوی تجربے کرتی۔

روسی حکومت پولینڈ والوں کی تعلیم و ترقی کو ابھی تک ناپسند کرتی تھی۔ اس لئے مانیا نے کئی نوجوان طالب علموں کے ساتھ مل کر ایک خفیہ انجمن بنائی جس کا مقصد کسانوں اور مزدوروں کو تعلیم دینا تھا۔ ہر شام اس انجمن کا ایک رکن مدرسے میں تعلیم دیتا اور یہ تعلیم مفت تھی۔ ہر رکن وہ مضمون پڑھاتا جس میں اسے سب سے زیادہ دلچسپی تھی۔ مظلوم اہل پولینڈ اس مدرسے کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ تعلیم انہیں سیاسی آزادی حاصل کرنے میں بڑی مدد دے گی۔ اس اسکول میں مانیا نے سب سے بڑا سبق یہ سیکھا کہ علم بہت زیادہ ضروری ہے اور اس کا تعلیم حاصل کرنے کا شوق اور تیز ہوگیا۔

بالآخر مانیا نے اپنی بہن کو یہ خط لکھا:۔

"اس کا تصفیہ کرو کہ کیا تم سچ مچ مجھے اپنے گھر رکھنے کو تیار ہو کیونکہ اب میں آسکتی ہوں۔ میں نے اتنا پیسہ جمع کرلیا ہے کہ اپنے اخراجات برداشت کرلوں۔ اگر تم خود تکلیف اٹھائے بغیر مجھے کھانے کو دے سکتی ہو تو مجھے لکھ بھیجو۔ اس سے مجھے بڑی مسرت ہوگی۔ میں نے جو مصیبتیں اٹھائی ہیں ان کے بعد پھر میری روح کو تازگی حاصل ہوگی۔ بہرحال اس کے متعلق مجھے لکھنا ضرور۔ اگر میرے آنے کا

کوئی امکان ہے تو مجھے لکھنا کہ مجھے داخلہ کے لئے کون سا امتحان پاس کرنا پڑے گا۔ اور کس تاریخ تک بحیثیت طالبہ علم کے میرا نام لکھا جانا ضروری ہے۔ میں اس سفر کے خیال سے اس قدر پریشان ہوں کہ جب تک تمہارا جواب نہ آ جائے اور کسی چیز کے متعلق نہیں لکھ سکتی .... تمہارے پاس میرے ٹھہرنے کی جگہ ہے؛ میں تمہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گی۔ نہ تم میری وجہ سے اکتانے پاؤ گی۔ اور نہ ہی تمہارے گھر میں پھوہڑپن برتوں گی میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں مجھے صاف صاف جواب دو۔"

بروںیا کا جواب جلد ہی آگیا۔ اور بہت جلد چھوٹی بہن سفر کے لئے اپنا اسباب باندھنے لگی۔ وہ فرطِ جذبات سے عجب حال میں تھی۔ پیرس کا یہ سفر اس لحاظ سے تلخ تھا کہ وہ اپنے پیارے باپ کو چھوڑ کے جا رہی تھی، اور حُبِّ وطن کے اس کام کا سلسلہ منقطع ہو رہا تھا۔ جس میں وہ اب تک مصروف تھی۔ لیکن یہ سفر اس لئے خوشگوار بھی تھا کہ بالآخر اسے ساربون میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ اس کی بیٹی ایو کیوری نے اپنی کتاب "مادام کیوری" میں اس زمانے میں اپنی ماں کے جذبات کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

"رات کا وقت تھا۔ ٹرین جرمنی سے گزر رہی تھی۔ رات کے سناٹے میں انجن کی سیٹی اور پرانے لوہے کے پہیوں کی آواز آ رہی تھی وہ تہہ ہونے والی کرسی پر پیر سمیٹے بیٹھی تھی۔ اس کا سارا سامان جسے وہ بار بار گنتی اس کے پیچھے جما ہوا رکھا تھا۔ لیکن مانیا اس وقت سرور کے عالم میں تھی۔ وہ ماضی کے متعلق سوچتی اور پھر اپنے جادو بھرے سفر کے متعلق جس کی وہ اتنے دن تک منتظر رہی تھی۔

وہ مستقبل کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتی۔ اس کی طبیعت میں عجز و انکسار تھا۔ جس کے لحاظ سے وہ سوچتی کہ وہ جلد ہی تعلیم حاصل کر کے اپنے شہر وارسا واپس جائے گی۔ اور وہاں ایک چھوٹے سے اسکول میں نوکر ہو جائے گی۔

یہ تصور اس کے ذہن میں مطلق نہ آیا تھا کہ جس وقت وہ اس ٹرین میں سوار ہوئی اس نے گمنامی کو چھوڑ کر روشنی اور شہرت کے راستے پر سفر شروع کیا تھا۔ اب گمنامی اور یکسانی کے دن رات گزارنے کے بجائے وہ زندگی کی ایک وسعت اور عروج کے راستے پر سفر کر رہی تھی۔"

پیرس پہنچ کر مانیا نے جانفشانی سے پڑھنا شروع کیا۔ اب وہ بہت خوش تھی۔" اسے محنت کرنے کا جنون سا تھا۔ یونیورسٹی میں اسے دوسروں کے ساتھ مل جل کر کام کرنے اور لکھنے پڑھنے کا لطف بھی حاصل ہوا۔" جب تعلیم کا پہلا سال ختم ہوا تو مانیا سوربون کے کھچا کھچ بھرے ہوئے مدور ہال میں چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھی نتیجہ سننے کا انتظار کر رہی تھی۔ جب ممتحن نے نتیجہ سنایا تو اس نے جذبات کی کشمکش کے عالم میں سب سے پہلے اپنا نام سنا۔ وہ اپنی ہم جماعتوں میں سب سے زیادہ اعزاز حاصل کر کے اوّل آئی تھی۔

پیرس میں مانیا کو فرانسیسی تلفّظ کے لحاظ سے ماری کہتے تھے۔ ماری یہ معلوم کر کے بہت خوش ہوئی کہ اسے الکزنڈرووِچ وظیفہ عطا کیا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ دوسرے سال تعلیم جاری رکھ سکے گی۔ گرمیوں کی چھٹّیاں اپنے والد کے ساتھ وارسا میں گزار کر وہ پیرس واپس آئی اور چاہتی تھی کہ اپنے آپ کو طبیعات اور سائنس کے لیئے بالکل وقف کر دے۔ کاسمیر والے واقعے سے

اس کا دل اس قدر ٹوٹ گیا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں محبت اور شادی کا تصوّر بھی نہ کرنا چاہتی تھی۔ مگر تقدیر کچھ اور تھی۔ ایک شام کو وہ اپنے ایک پولش دوست میسو کوواسکی سے یہ تذکرہ کر رہی تھی کہ کوئی ایسا مقام نہیں جہاں وہ سائنسی تجربات کر سکے اس کے دوست نے کہا کہ "میں ایک بڑے صاحبِ کمال سائنسدان کو جانتا ہوں جو ریو لومونڈ میں طبیعات و کیمیا کے مدرسے میں کام کرتا ہے ممکن ہے اس کی تجربہ گاہ میں ایک آدھ کمرہ خالی ہو۔ بہر حال وہ تمہیں کچھ نہ کچھ مشورہ دے سکے گا۔ کل شام کو آ کے میرے اور میری بیوی کے ساتھ چائے پیو۔ میں اس نوجوان کو بھی مدعو کروں گا۔ شاید تم اس کا نام جانتی ہو گی —— پیر کیوری"

اپنی ڈائری میں ماری نے اس شخص سے اپنی ملاقات کا حال لکھا ہے جو آگے چل کے اس کا شوہر بنا:-

"جب میں اندر آئی تو پیر کیوری کھڑکی میں کھڑا تھا اس دروازے سے جو چھجّے کی طرف کھلتا ہے۔ وہ مجھے بہت کم عمر معلوم ہوا حالانکہ اس وقت اس کی عمر پینتیس سال کی تھی۔ میں اس کی نظر کی سچّائی اور اس کی بلند قامت کے ساتھ ساتھ اس کی خفیف سی لاپروائی سے متاثر ہوئی۔ وہ آہستہ آہستہ سوچ سوچ کے بات کرتا۔ اس کے انداز میں سادگی تھی، اور اس کی مسکراہٹ میں سنجیدگی اور جوانی کے ساتھ ساتھ اعتماد پیدا کرنے کی صلاحیت تھی۔ ہم دونوں نے باتیں شروع کیں۔ اور بہت جلد دوست بن گئے۔ گفتگو کا موضوع سائنس کے چند مسئلے تھے جن کے متعلق میں اس کی رائے معلوم کرنا چاہتی تھی۔"

دونوں کے درمیان سائنس کی محبّت کا راسخ رشتہ تھا۔ دونوں کو غیر معمولی

دماغ عطا ہوا تھا۔ شاید خود بخود دونوں کو لاشعوری طور پر اس کا احساس ہوا کہ دونوں کو مل کے بہت بڑا کام انجام دینا ہے۔ غرض دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے۔ لیکن ایک سال لگے بعد کہیں جا کے ماری تیار ہوئی کہ پیر کیوری سے شادی کرنا منظور کرے۔ حالانکہ اسے بھی پیر سے ویسے ہی والہانہ محبّت تھی جیسے پیر کو اس سے تھی۔ لیکن ایک فرانسیسی سے شادی کرنا، عمر بھر کے لئے اپنا وطن چھوڑنا، اپنی سیاسی زندگی اور پولینڈ کی خدمت کے لائحہ عمل کو ترک کرنا تھا ان سب مسائل کی وجہ سے اسے تصفیہ کرنے میں دیر لگی۔ لیکن وہ زیادہ عرصہ تک شادی کو ملتوی نہ کر سکے۔ ۲۶ جولائی ۱۸۹۵ء کو ان دونوں عظیم سائنسدانوں کی شادی ہوگئی۔

ان دونوں کا پہلا گھر بڑا معمولی سا تھا۔ ایک چھوٹا سا فلیٹ تھا جو طبیعات کے مدرسے کے قریب ہی واقع تھا۔ اس میں اگر کوئی اچھی چیز تھی تو ایک رنگین باغ کا منظر جس کو دیکھ کے پیر کیوری کی تھکن رفع ہو جاتی۔ پیر کو تنہائی کے گوشے اور خاموشی پسند تھی۔ جہاں وہ گھنٹوں سوچ سکتا۔ حالانکہ اسکول میں مدرّسی کرنا اتنی مشقّت کا کام تھا کہ اسے سوچنے کا موقع کم ملتا۔ یہ جان کر کہ اس کے شوہر کو خاموشی اور سوچ بچار کے لمحات کی کتنی سخت ضرورت ہے۔ ماری نے کچھ پیسے پس انداز کئے اور دو سائکلیں خرید لیں۔ گرمیوں کی مختصر چھٹّیوں میں دونوں شہر کے باہر جنگلوں میں سائیکلوں پر نکل جایا کرتے تاکہ فکروں سے نجات پائیں۔

ستمبر ۱۸۹۷ء میں ان دونوں کی پہلی اولاد پیدا ہوئی۔ یہ لڑکی تھی جس کا نام انہوں نے آئرین رکھا۔ ماری اپنی سائنسی زندگی اور اپنی خانگی زندگی دونوں کو بیک وقت کامیاب بنانا چاہتی تھی۔ اس کی لڑکی نے لکھا ہے "وہ بیوی کی محبّت، ماں کے فرائض اور سائنس تینوں کو مساوی رتبہ دیتی تھی۔ اور اس کا خیال رکھتی تھی کہ ان تینوں فرائض میں سے کسی کی حق تلفی نہ ہونے پائے۔ جوش اور ہمت

کی وجہ سے وہ تینوں میں پوری کامیاب رہی"۔

بچی کے پیدا ہونے کے کچھ ہی عرصے بعد ماری نے ایک مضمون کی تلاش شروع کی جس پر وہ ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے مقالہ لکھ سکے۔ اس زمانے میں ایک اور سائنس دان آنری بے کیرل نے یہ اطلاع شائع کی تھی کہ اس نے یورے نیم کے نمک ریزوں میں ایک عجیب چیز دیکھی ہے ـــــ ایک طرح کی نامعلوم شعاعیں۔ ماری نے اس انکشاف سے مسحور ہو کے یہ تصفیہ کیا کہ وہ اپنے مقالے کے لئے یورے نیم پر تجربات کرے گی۔ اس وقت اسے معلوم نہ تھا کہ اپنے مقصد تک پہنچنے کے لئے اسے سالہا سال یورے نیم کے متعلق تحقیق کرنی پڑے گی۔ نہ اسے یہ پتہ تھا کہ اس کی منزل مقصود کتنی عجیب وغریب اور کتنی اہم ثابت ہو گی۔

تدریس کے درمیانی وقفوں میں پیرؔ فلزات (دھاتوں) پر تجربہ کیا کرتا تھا۔ اس کام کی وجہ سے اسے بعد میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ لیکن اپنی بیوی کی اس نئی تجویز سے اسے بھی اتنی دلچسپی ہو گئی کہ اس نے بھی یورے نیم پر تحقیق شروع کی جس میں اس کی بیوی اس قدر محو تھی۔ دونوں سائنسدان ایک معمولی سی تجربہ گاہ میں کام کرتے کرتے تھک جاتے کہ یورے نیم سے اس نامعلوم جزو کو الگ کریں، یہ دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے کہ پچ بلینڈ (یعنی وہ بنیادی دھات جس سے یورے نیم حاصل کیا جاتا ہے) میں اس سے حاصل شدہ خالص یورے نیم کے مقابل چوگنا زیادہ ریڈیائی عمل موجود ہے۔ اس کے کیا معنی ہیں؟ ایک ہی جواب تھا کہ پچ بلینڈ میں کوئی اور جوہر موجود ہے جس میں یورے نیم کے مقابل ریڈیائی عمل کی صلاحیت کہیں زیادہ موجود ہے۔ طرح طرح کے ان تھک تجربوں کے بعد میسو اور مادام کیوری نے ایک بڑے ریڈیائی عمل کرنے والے جوہر کو علیٰحدہ کر لیا۔ ماری نے اپنے

وطن کے نام پر اس کا نام پولونیم رکھا۔ لیکن یہ صاف ظاہر تھا کہ ایک اس سے بھی زیادہ بڑی طاقت پچ بلینڈ میں پوشیدہ ہے۔ اس لئے جوش و خروش سے تحقیق کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور آلات کی کمی کی وجہ سے ان دونوں کی ہمت پست نہ ہونے پائی۔ اس طرح ۱۸۹۸ء میں پیرا اور ماری کیوری نے اس جوہر کو دریافت کیا جس کو وہ اتنے عرصے سے تلاش کر رہے تھے۔ اور بعد کے تجربوں سے پتہ چلا کہ یہ یورے نیم کے مقابلے میں ڈیڑھ سو ملین گنی زیادہ کے ریڈیائی عمل اور تابش کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس نئے جوہر کا نام انہوں نے ریڈیم رکھا۔

اس تحقیق میں ان دونوں کو جو کامیابی ہوئی اور اس کامیابی سے جو مسرت انہیں حاصل ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ ایو کیوری ایک واقعے کا ذکر کرتی ہے جس سے اس وقت ان دونوں کے جذبات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"اس حقیر سے سائبان میں جہاں الماریاں تک نہ تھیں، میزوں پر یا دیوار میں جڑے ہوئے تختوں پر چھوٹی چھوٹی شیشیوں میں بیش قیمت ذرے دمک رہے تھے۔ اور ان کے فاسفورس جیسے نیلے نقوش رات کی تاریکی میں چمک رہے تھے۔

"دیکھو...... دیکھو" نوجوان عورت نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

وہ آہستہ آہستہ احتیاط سے آگے بڑھی۔ ایک بید کی کرسی ڈھونڈھ کر اس پر خاموشی سے بیٹھ گئی۔ ان دونوں کی آنکھیں ٹکٹکی باندھ کے ان چمکتے ہوئے ذرات کو دیکھ رہی تھیں۔ جو اس ریڈیائی چمک کا پُر اسرار سرچشمہ تھے ...... یہ ان کا ریڈیم تھا۔

اس کے ساتھی نے آہستہ سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

اسے یہ جگنوؤں والی، یہ جادو بھری رات ساری عمر یاد رہی"

ان دونوں سائنسدانوں نے اس خستہ حال سائبان میں ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۲ء تک چار سال اور تجربے کرتے ہوئے گزارے تاکہ دنیا پر ریڈیم کا وجود ثابت کر سکیں۔ ماری ان ایّام کے متعلق اپنی ڈائری میں لکھتی ہے:۔

"ہمارے پاس پیسہ نہیں تھا۔ نہ تجربہ گاہ تھی۔ نہ اس سخت اور مشکل کام میں کوئی مدد کی صورت تھی۔ یہ کسی چیز کو عدم محض سے وجود میں لانے کا سا مسئلہ تھا۔ میں بلا مبالغہ یہ عرض کر سکتی ہوں کہ یہ زمانہ میرے اور میرے شوہر کے لئے بڑی جسارت اور ہمّت کی زندگی کا تھا۔

...... لیکن اس ٹوٹے پھوٹے پرانے سائبان میں ہماری زندگی کے بہترین سال گزرے جو محض کام کے لئے وقف تھے۔ میں اکثر سارا سارا دن اپنے قد کے برابر لوہے کے ایک اونچے ٹکڑے سے کڑھائی میں جوش کھاتی ہوئی دھاتوں کو ہلاتی رہتی۔ شام کو میں تھکن سے چُور چُور ہو جاتی"

جب ۱۹۰۲ء میں ریڈیم کی دریافت کی باقاعدہ اطلاع شائع ہوئی تو سائنس کی دنیا میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ ریڈیم اس قدر طاقتور ثابت ہُوا کہ اس سے فوٹوگرافی کی تختیاں سیاہ پڑ جاتیں۔ اس سے طرح طرح کے کیمیائی عمل پیدا ہوتے اور چھوٹے چھوٹے جراثیم فنا ہو جاتے۔ آخرالذکر صفت کی بنا پر اسے سرطان، پھوڑوں اور دوسری طرح کے ناسوروں کے علاج کے لئے انتخاب کیا گیا۔ چونکہ ریڈیم کے ذرا سے چھو لینے ہی سے جلد بُری طرح جل جاتی تھی، اس لئے ہاتھوں سے ریڈیم کو چھونا ناممکن تھا۔ ماری کیوری کے ہاتھ اس جوہر کو ہمیشہ برتنے کی وجہ سے سُن

ہو گئے تھے۔ اور وہ اکثر اپنی انگلیوں پر اپنا انگوٹھا رگڑا کرتی تھی کہ دورانِ خون جاری رہے۔

میاں بیوی کو بہت سے اعزاز ملے۔ نومبر ۱۹۰۳ء میں انہیں ڈیوی تمغہ ملا۔ اسی سال انہیں طبیعیات میں نوبل پرائز عطا کیا گیا۔ اوسی رس پرائز اور دیگر اعزاز عطا کئے گئے۔ لیکن شہرت پا کے دونوں سائنس دانوں کو زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔ وہ تو اپنے اسی سائبان میں محنت کرنے میں زیادہ خوش تھے بہ نسبت اس کے کہ ساری دنیا کی نظریں ان پر جمی رہیں۔

دسمبر ۱۹۰۴ء میں ان کی دوسری لڑکی ایو پیدا ہوئی۔ اس لڑکی کے پیدا ہونے کے دو سال بعد ماری کی نظروں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ ۱۹ اپریل ۱۹۰۶ء کو پیر کیوری مارا گیا۔ ہفتوں ماری سکتے کے عالم میں خاموش رہی۔ نہ وہ بات کر سکتی تھی نہ اپنا رنج والم ظاہر کر سکتی تھی۔ پیر کیوری ایک گاڑی کے نیچے آ کے کچلا گیا تھا۔ اس دن سے ماری بالکل بدل گئی۔ اس کی زندگی کی حرارت اور جوش جاتا رہا۔ وہ خاموش رہنے لگی۔ صرف اس کی ڈائری سے اس کے جذبات و احساسات کا اندازہ ہوتا ہے:-

> "میرے پیر میں مسلسل تمہارے متعلق سوچتی رہتی ہوں۔ میرا سر پھٹنے کو ہے۔ میں پاگل ہوئی جا رہی ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں دیکھے بغیر میں کیسے زندہ رہ سکتی ہوں۔ تم جو میرے جیون ساتھی تھے تمہیں دیکھ کر مسکرائے بغیر میں کیسے زندہ رہ سکتی ہوں۔"
>
> دو دن ہوئے کہ درختوں کی پتیاں پھوٹ نکلیں اور باغ حسین و شاداب معلوم ہوتا ہے۔ آج میں نے وہاں بچوں کو دیکھا۔ تم ہوتے تو تمہیں وہاں بچے بڑے پیارے معلوم ہوتے اور تم مجھے بلا کے نرگس کے

پھول دِکھلاتے کل قبرستان میں جب میں نے تمہارے مزار پر "پیر کیوری"
کندہ دیکھا تو میں ان الفاظ کا مطلب نہ سمجھ سکی۔ منظر کی دلکشی مجھے
تکلیف پہنچاتی ہے۔ میں اپنے چہرے پر نقاب ڈالے ہوں تا کہ
ساری دنیا مجھے پردے کے باہر نظر آئے۔"

یہ بھی تقدیر کا کرشمہ تھا کہ ماری کا تقرر سابون میں طبیعات کی پروفیسری پر ہُوا۔ جس خدمت پر اس سے پہلے اس کا شوہر مامور تھا۔ اس نے اس کے بعد لکچروں کا سلسلہ جاری کیا۔ اور وہ کام جو دونوں نے مل کر شروع کیا تھا وہ اکیلی کرتی رہی۔

ریڈیم کی دریافت سے طِب میں ایک نئی شاخ یعنی ریڈیم کے ذریعے علاج کرنے کا اضافہ ہُوا۔ اور تیزی سے اس میں ترقّی ہونے لگی۔ اس علاج میں بڑی ضرورت اس کی تھی کہ ایک بنیادی معیار متعیّن کر لیا جائے۔ تاکہ اسی لحاظ سے ریڈیم کی مقدار کا تعیّن کیا جا سکے۔ اس کام میں ماری کیوری سے مدد مانگی گئی۔ ریڈیم کا پہلا بین الاقوامی معیار تیار کرنے پر ۱۹۱۱ئہ میں اسے پھر نوبل پرائز دیا گیا۔ اس کے سوا اور کسی کو نوبل پرائز زندگی میں دو بار نہیں مِلا۔

اب سائنسی کام اور تدریس کے ساتھ ماری کیوری نے کئی کتابیں مرتّب اور تصنیف کیں۔ جو ریڈیائی عمل اور ترکیب کے متعلق ہیں۔ ان کے علاوہ اس نے اپنے شوہر پیر کیوری کے سائنسی مضامین کو جمع کر کے ۱۹۰۸ئہ میں شائع کیا۔

پہلی جنگ عظیم میں اس مشہور و معروف خاتون نے بہت سا وقت ریڈیالوجی کے مرکز قائم کرنے۔ ایکس رے کی مشینوں کا استعمال سکھانے میں صرف کیا جن کے ذریعے سے جسم اور ہڈّیوں کے اندرونی زخم وغیرہ صاف نظر آتے ہیں۔ جنگ میں ریڈیالوجی کے ٹرک بہت کام آئے۔ یہ ماری کیوری ہی کی تجویز سے بنائے گئے

تھے۔ اور ان کو انجمن صلیب احمر کی مدد سے تیار کیا گیا تھا۔ اس طرح کی طبی امداد تیار کرنے ہی پر اس نے اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ ان علاقوں میں گئی جہاں گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ اور وہاں ان نئی طبی ایجادوں سے کام لینے میں مدد کی۔ کبھی کبھی وہ خود ٹرک چلاتی۔ ایپاں، کیلیے، وردان، نانسی اور صف اوّل کی اور بہت سی رزم گاہوں میں جہاں علاج اور جرّاحی کا انتظام نہ تھا وہ خود علاج اور ریڈیائی سامان لے کر پہنچتی۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں امریکی عورتوں نے اسے ریاستہائے متحدہ امریکہ میں مدعو کیا تاکہ اسے ریڈیم کا تحفہ پیش کریں۔ اور اسے تحقیقات میں مدد مل سکے۔ یہ ریڈیم جس کا وزن ایک گرام تھا پانچ سو آدمیوں نے چھ ماہ کی محنت میں اکٹھا کیا تھا۔ جب ماری سے پوچھا گیا کہ اس نے اور اس کے شوہر نے اس بیش قیمت جوہر کے حقوق اپنے نام کیوں نہیں محفوظ کرائے تو اس نے جواب دیا "ہم نے سائنس کی خدمت کے لئے محنت کی ہے۔ ریڈیم اس لئے نہیں کہ لوگ اس کی وجہ سے امیر بن جائیں۔ یہ ایک جوہر ہے۔ یہ تمام بنی نوع انسان کی ملکیت ہے"۔ اگر وہ ریڈیم کے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کرا لیتی تو صرف فرانس کے اسپتالوں اور تجربہ خانوں کو بڑا فائدہ پہنچتا۔ اور اسے خود بڑی مالی منفعت حاصل ہوتی لیکن ماری کیوری کو اس کا یقین تھا کہ بنی نوع انسان کو ایسے خوش آئند خواب دیکھنے والوں کی ضرورت ہے۔ جو کسی ذاتی نفع کے خیال کے بغیر کام کاج میں لگے رہیں۔ اور اپنے مالی فائدے کا خیال تک دل میں نہ لائیں۔

ماری کیوری کی زندگی کے آخری سال اس کے تجربہ خانے کے دلچسپ کام کاج میں گزرے۔ بالآخر ۴ جولائی سنہ ۱۹۳۴ء میں یہ عورت جسے اتنے تمغے، انعام، اعزاز ملے تھے کہ ان کو یہاں آسانی دہرایا نہیں جا سکتا۔ سان سلوزنہ کے ایک شفاخانے میں

فوت ہوگئی۔ ڈاکٹر اس پر متفق ہیں کہ اس کی موت کا باعث وہ ریڈیائی عمل کرنے والے ذرات ہیں۔ جن سے ساری عمر اپنے تجربات کے دوران میں اس کا سابقہ رہا، اور اس کے محبوب ریڈیم سے نکل کے ان ذرات نے اس کے جسم کو چھلنی کر دیا۔ سو کے قبرستان میں وہ اپنے شوہر کے پہلو میں دفن ہوئی۔ اسکی تجربہ گاہ جو اب پیرس یونیورسٹی کے ریڈیم انسٹیٹیوٹ میں "کیوری تجربہ گاہ" کہلاتی ہے، اب بھی ایک "کیوری" کی نگرانی میں تحقیق کر رہی ہے ــــــ یہ اس کی لڑکی آئرین ہے۔ جس کا شوہر تحقیق میں اس کی مدد کرتا ہے۔ اور ان دونوں کی وجہ سے انسٹی ٹیوٹ بہت مشہور رہے ؛

ایمیلیا ایرہارٹ

ہوا باز

سنہ ۱۸۹۷ء تا سنہ ۱۹۳۶ء

ایک سالگرہ کی محفل تھی۔ اس میں ایک ننھی منی لڑکی، جس کے بال چمکیلے ربن سے بندھے ہوئے تھے۔ جو پھولا پھولا کلا دار لباس پہنے تھی۔ لانبے کالے موزے اور لانبے کالے بوٹ پہنے تھی۔ ایک جھولتی ہوئی کرسی پر پریشان پریشان بیٹھی تھی۔ ویسے پارٹیاں تو بڑے مزے کی چیز ہیں۔ لیکن اس طرح کپڑے پہننا اور پھر اس کا خیال رکھنا کہ اچھا لباس میلا نہ ہو جائے۔ یا اس پر کوئی چیز گر نہ پڑے دھبّہ نہ لگ جائے۔ یہ بڑی مصیبت تھی۔ اور یہ لڑکی تو اور بہت سی چیزوں کے متعلق سوچ رہی تھی۔ ایک تو پڑوسی کی گھوڑی نیلی ہی تھی۔ اسے اگر نیلی پر سواری کا موقع ملے تو وہ کبھی نہ پارٹیوں میں آئے۔ اور نہ ہی آئس کریم کھائے۔ پھر اسے وہ لکڑی کا تختہ یاد آتا تھا۔ جو اس کی بہن اور اس کی رشتہ کی بہنوں اور اس نے خود بنایا تھا۔ جس پر وہ رواں ہوتی تو کہتی "دیکھو تو یہ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی ہوا میں اڑ رہا ہو" اسے بہت غصّہ آتا کہ اس کے ماں باپ نے یہ چھین لیا اور کہا کہ یہ ننھّی لڑکیوں کے لئے بہت خطرناک ہے۔ لیکن اس لمبی لمبی ٹانگوں والی لڑکوں جیسی لڑکی کو ابھی بہت دُور دُور اڑنا تھا —— یہ لڑکی ایمیلیا ایرہارٹ تھی۔

ایمیلیا ایرہارٹ جو طیارچی عورتوں میں سب سے زیادہ مشہور ہوئی ایچی سن، کین ساس میں سنہ ۱۸۹۷ء کو پیدا ہوئی۔ اس کے نانا نانی کین ساس کو فلاڈلفیا سے

اس زمانے میں آئے تھے جب مغرب میں امریکی انڈین اکثر نظر آتے تھے۔ ان کا شمار جلد ہی اپچی سن کے سربرآوردہ شہریوں میں ہونے لگا۔ یہ جج اور مسز آلفرڈ اوٹس تھے۔ اس کا دادا جو ۱۸۵۶ء میں کین ساس آیا۔ پن سلوے نیا میں لوتھری کلیسا کا پادری تھا۔ وہ اپچی سن کے قریب ایک کالج میں یونانی اور عبرانی زبانوں کی تعلیم بھی دیا کرتا تھا۔ اور اپنی چھ لڑکیوں اور چھ لڑکوں کو پالتا پوستا تھا۔ ان میں سے سب سے چھوٹے لڑکے نے وکالت شروع کی اور جج اوٹس کی لڑکی سے ۱۸۹۵ء میں شادی کرلی۔ وہ اپنی دونوں لڑکیوں امیلیا اور میورل کو گھر سے باہر کی زندگی کا لطف اٹھانا سکھاتا۔ اور اکثر انہیں اپنے ساتھ ماہی گیری کے لئے ڈیس موائے سن ندّی کے کنارے لے جاتا۔ دوسری لڑکیوں کے والدین ایرہارٹ لڑکیوں کو بہت نڈر اور ڈھیٹ سمجھتے۔ کیونکہ وہ دوسری لڑکیوں کی طرح فراکیں پہننے کی بجائے ورزشی کپڑے پہنتیں۔ گڑیوں کے لئے جو چھوٹی سی گاڑی انہیں ملی تھی۔ اس میں گڑیوں کو ٹہلا کے سیر کرانے کی بجائے امیلیا اور میورل اپنے بڑے سے کُتّے جیمز فروشس کو اس گاڑی میں باندھ دیتیں، اور اس کے آگے آگے ہڈّی سنگھاتی ہوئی دوڑتیں اور کتا ان کے پیچھے گاڑی کو کھینچتا ہُوا دوڑتا۔

مسٹر ایرہارٹ راک آئی لینڈ ریلوے کمپنی کا وکیل تھا۔ اس لئے اس کا زیادہ تر وقت اس کمپنی کی ریلوں پر سفر کرنے میں گزر جاتا۔ جب وہ کسی لمبے سفر پر جاتا تو اپنے خاندان کو اپنے ساتھ لے جاتا۔ اور اس کے بال بچّے اس کے ساتھ اسی کے سیلون میں رہتے۔ امیلیا اور اس کی بہن نے کین ساس سٹی، ڈیس موائنس، سینٹ پال اور شکاگو غرض کئی شہروں کے اسکولوں میں تعلیم پائی۔ آخری زمانے میں جب کوئی امیلیا سے کہتا "میں تمہارے ہی شہر کا رہنے والا ہوں" تو وہ پوچھتی "کس شہر کے"؟ بالآخر اس نے ہائیڈ پارک ہائی اسکول شکاگو سے ڈگری

حاصل کی حالانکہ ان چار سالوں میں وہ پانچ چھ نامی اسکولوں میں تعلیم پا چکی تھی۔

گھر پر ایک سال گزار کے ایمیلیا اوگونٹز نامی اسکول پن سلوے نیا میں داخل ہوئی۔ اس کی بہن نے سینٹ مارگرٹ کالج ٹورن ٹو میں داخلہ لیا۔ جہاں اس سے ملنے کے لئے اپنے کالج کے آخری سال ایمیلیا کرسمس کے زمانے میں گئی۔ جب اس نے ٹورن ٹو کی سڑکوں پر لنگڑے لولے سپاہیوں کو دیکھا تو پہلی مرتبہ اسے پہلی جنگِ عظیم کے سانحات اور مصائب کا اندازہ ہوا۔ اگلے سال کالج واپس آنے کے بجائے وہ ٹورن ٹو ہی میں اسپاڈی نا کے فوجی اسپتال میں نرسوں کی مددگار بن گئی۔ جہاں باورچی خانے اور دواخانے کی صفائی۔ فرش صاف کرنا، زخمیوں کی پیٹھ پر پالش کرنا۔ اس کے فرائض میں داخل تھا۔

جس زمانے میں وہ ٹورن ٹو میں یہ کام کاج کرتی اسے پہلی مرتبہ ہوابازی سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ایک دن ایک میلے میں اس نے پہلی جنگِ عظیم کے ایک ہواباز کو تماشہ کے لئے ہوائی جہاز اڑاتے دیکھا۔ ہوائی پرواز کے سحر سے وہ مسحور ہوگئی۔ وہ اکثر سہ پہر کو ہوائی مشق کے میدان میں جانکلتی۔ جہاں نوجوانوں کو طیارہ رانی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ وہ خود ایک ہوائی جہاز میں اڑنا چاہتی تھی لیکن کسی غیر فوجی کو ان دنوں پرواز کرنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ ہوائی میدان میں ہوابازوں کو کھلے اور معمولی سے ہوائی جہاز اڑا کے لے جاتے دیکھتی اور جہاز کے پروں سے برف اڑ اڑ کے اس کے چہرے پر گرتی۔ اس زمانے میں ہواباز اپنے چہروں پر چکنائی مل لیتے تھے کہ ہوا کے تھپیڑوں کو برداشت کرسکیں۔ اور ان کے سروں پر روئی دار خود ہوا کرتا تھا۔

پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے پر امیلیا (یا "اے۔ای" کیونکہ بعد میں وہ اسی لقب سے مشہور ہوئی) کولمبیا یونیورسٹی میں داخل ہوئی اور اپنے لئے بڑا سخت کورس انتخاب

کیا۔ اسپتال کی نوکری کے زمانے میں اسے طب سے دلچسپی ہوگئی تھی۔ اس نے سوچا کہ ڈاکٹری کا پیشہ اختیار کرے۔ ڈاکٹری سے پہلے کی تعلیم کا نصاب اسے بہت دلچسپ معلوم ہوا۔ لیکن ایک سال بعد اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ کبھی اچھی لیڈی ڈاکٹر نہ بن پائے گی۔ ممکن ہے کہ اس کے اس فیصلے پر ان ہوائی جہازوں کا اثر پڑا ہو جو اس نے کناڈا میں اڑتے دیکھے تھے۔

اگلی گرمیوں میں وہ کیلی فورنیا پہنچی جہاں اس زمانے میں اس کے والدین مقیم تھے۔ ایک دن وہ اپنے باپ کے ساتھ لاس اینجلز کے قریب ہوائی جہازوں کا تماشا دیکھنے گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنے باپ سے کہا "ابا جان ذرا اس ہوا باز سے پوچھئے کہ پرواز کرنا سیکھنے میں کتنی مدت لگتی ہے۔" اس کا باپ یہ پوچھنے چلا گیا۔ اور وہ بے صبری سے اس کا انتظار کرنے لگی۔ بالآخر وہ یہ جواب لایا۔ کسی کو زیادہ دیر لگتی ہے کسی کو کم۔ مگر عام طور پر دس گھنٹے میں ہوائی جہاز اڑانا آجاتا ہے۔" ایمیلیا نے پھر منت کر کے کہا "ایک سوال اور پوچھ لیجئے۔ سیکھنے کی فیس کتنی ہوتی ہے۔" اس کے باپ نے اسے حیرت سے دیکھا لیکن پھر ہوا باز سے پوچھا اور جواب دیا۔ ایک ہزار ڈالر۔ تم یہ کیوں معلوم کرنا چاہتی ہو؟" اے۔ ای نے جواب دیا "میں نے یوں ہی پوچھا" لیکن یہ اس نے یوں ہی نہیں پوچھا تھا۔ وہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ پرواز کیسے کی جاتی ہے اور بہت جلد اسے موقع مل گیا۔ ایک نوجوان پائیلاٹ فرینک ہاکس جس کا نام اس وقت تک مشہور نہیں ہوا تھا۔ لیکن جو بعد میں پرواز میں تیز رفتاری کا ریکارڈ قائم کرنے کی وجہ سے مشہور ہوا، اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ لاس اینجلز میں ول شائر بولوارڈ کے قریب ایک میدان سے اڑا۔ جہاز اس اونچی نیچی زمین پر بلند ہوا، پھر تیل کے گوداموں پر سے ہوتا ہوا شہر کے اوپر پرواز کرنے لگا۔

اور اس وقت ایمیلیا ایرہارٹ کو یقین تھا کہ ایک دن وہ خود ہوائی جہاز چلائیگی اس دن رات کے کھانے پر اس نے کہا "میں ہوائی جہاز چلانا سیکھنا چاہتی ہوں"۔ اس کے باپ مسٹر ایرہارٹ نے کہا" چلو ٹھیک ہے۔ کب سے سیکھنا شروع کروگی" اس کے بعد ہی ایمیلیا نے میدان میدان پھر کے یہ تلاش شروع کی کہ کوئی اسے ہوائی جہاز چلانا سکھادے۔ بالآخر وہ نیٹا اسنوک کی شاگرد بنی۔ یہ پہلی عورت تھی جس نے ہوا بازی کے کرٹس اسکول سے سند حاصل کی تھی جب مسٹر ایرہارٹ نے احتجاج کیا کہ فیس بہت زیادہ ہے تو آے۔ای نے ٹیلیفون کمپنی میں نوکری کرلی۔ ہفتے بھر وہ نوکری کرتی اور ہفتہ اتوار کو ہوائی میدان میں ہوائی جہاز چلانا سیکھتی۔

بالآخر اس کی زندگی کا ایک بڑا یادگار دن آیا۔ جب وہ اکیلی ہوائی جہاز اڑانے کے قابل ہوئی۔ آج وہ پہلی مرتبہ ہوائی جہاز میں اکیلی تھی۔ اسے نہ خوف معلوم ہوا نہ اچنبھا بلکہ بڑی طمانیت اور خوشی حاصل ہوئی۔ کیونکہ اب اسے معلوم ہوگیا تھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ یہی کام اسے پسند تھا۔ یعنی ہوائی جہاز چلانا۔ اس کی ماں کو اندازہ ہوگیا کہ لڑکی کو طیارہ رانی سے کس قدر شغف ہے اور اس نے اسے ایک پرانا، پیلے رنگ کا اسپورٹ ماڈل طیارہ خریدنے میں مالی مدد دی۔ ہوائی جہاز کے لئے ہینگار میں جگہ حاصل کرنے کے بدلے اس نے اس جہاز کے بنانے والے کو اس کا حصہ دار بنالیا۔ اس انجینئر کو اس سودے سے اس لئے دلچسپی تھی کہ اس طرح دوسرے لوگ بھی اس نمونے کے ہوائی جہاز کو دیکھیں اور پسند کریں گے۔

ایمیلیا اپنی فرصت کا سارا وقت پرواز میں صرف کرتی۔ بعض لوگوں نے اس سے عجیب و غریب فرمائشیں کیں۔ اس زمانے میں شراب نوشی ممنوع تھی، کسی

نے اس سے فرمائش کی کہ سرحد پار سے کچھ شراب لے آئے۔ اس طرح چوری چھپے اکثر ہوا بازی کرایا کرتے تھے۔ لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ اپنی ہوابازی کے ابتدائی دور ہی میں اس نے یہ ریکارڈ قائم کیا کہ ہر عورت کے مقابل زیادہ بلندی تک پرواز کی۔ اسے ہوائی جہازوں کے انجنوں سے بھی دلچسپی ہو گئی تھی اس لئے اس نے ان کے متعلق بھی معلومات حاصل کرنی شروع کیں۔ وہ انجنوں کے خاکے بغور دیکھتی اور ان کے متعلق ماہرینِ فن سے گفتگو کرتی۔ جس قسم کا ہوائی جہاز خود اڑایا کرتی تھی اس کی خرابیوں کا تجزیہ کر کے اور اس کو بہتر بنانے کے طریقوں پر اس کے انجینئرز سے بحث کر کے اس نے اس قسم کے ہوائی جہاز کی ساخت کو بہتر بنایا۔

اب اسے ای کو اپنی زندگی کے اصلی مقصد یعنی پرواز کا علم ہو گیا تھا لیکن اس کے دل میں اب بھی مزید تعلیم حاصل کرنے کی خواہش تھی۔ چنانچہ وہ مشرقی ساحل کو واپس آئی۔ اور کولمبیا یونیورسٹی اور ہارورڈ یونیورسٹی کے گرمیوں کے کالج میں تعلیم حاصل کرتی رہی۔ اسے سماجی کار خیر سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ ۱۹۲۷ء میں اس نے ڈینی سن ہاؤس بوسٹن میں جو کار خیر کا ایک پرانا امریکی مرکز تھا لڑکوں اور لڑکیوں کو پڑھانا شروع کیا۔ اور بچوں کے ناخواندہ والدین کو انگریزی لکھنا پڑھنا سکھاتی رہی وہ یہ جانتی تھی کہ سماجی کام کی وجہ سے بچوں کو ایسے تجربے حاصل ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ان میں زندگی کا لطف باقی رہتا ہے، اور وہ اپنی غربت کی زندگی کو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکتے ہیں۔ بعد میں جب لوگ نکتہ چینی کرتے کہ اس نے سماجی کام چھوڑ کے پھر سے ہوابازی شروع کی تو وہ جواب دیتی "یہ بھی سماجی کام ہے میں لکھتی ہوں، لکچر دیتی ہوں، ریڈیو پر تقریریں کرتی ہوں۔ میں صحیح انگریزی بولنا اور لکھنا تو نہیں سکھاتی لیکن میں اب بھی معاشرے کی خدمت

انجام دے رہی ہوں۔"

جس زمانے میں ایمیلیا بوسٹن کے اس سماجی مرکز میں کام کر رہی تھی وہ ہوا بازی سے بے نیاز نہیں رہی۔ وہ ہوا بازی کی قومی انجمن کی بوسٹن والی شاخ کی رکن تھی۔ اور بعد میں وہ اس کی وائس پریسیڈنٹ منتخب ہوئی۔ جب اسے موقع ملتا وہ پرواز کرتی۔ اور مختلف لوگوں کے ساتھ مل جل کر ہوا باز عورتوں کی تنظیم کرتی۔ اس کے علاوہ اپنے پرانے دوست کنر کی معرفت جو کیلی فورنیا میں ہوائی جہاز بناتا تھا۔ وہ ہوا بازی کی ایک تجارتی کمپنی میں حصہ دار بن گئی۔ اس کے علاوہ اور چار افراد کے ساتھ وہ بوسٹن کے ایک ہوائی میدان کی مالک تھی۔

ایک دن جب کہ اے ای بچوں کو پڑھا رہی تھی ایک چھوٹا سا لڑکا دفتر سے دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا "مس ایرہارٹ" ٹیلیفون۔ ٹیلیفون" اس نے جواب دیا "میں ابھی کام میں ہوں۔ کہہ دو کچھ دیر بعد ٹیلیفون کرو۔ لیکن لڑکے نے کہا" وہ کہہ رہا تھا کہ بہت ضروری کام ہے۔" ٹیلیفون پر ایک مرد کی آواز نے اس سے پوچھا۔ کہ کیا وہ ہوائی جہاز پر کوئی خطرناک کرتب کر دکھانے پر تیار ہے۔ ایمیلیا کی طبیعت میں تجسس تھا اور اسے خطرہ مول لینے اور پرواز کرنے سے دلچسپی تھی۔ اس نے کہا "یقیناً" اور اس شام کو وہ کپتان ایچ ایچ رائیلی سے ملی جس سے نیو یارک کے ایک دوست نے کہا تھا کہ ہوا بازی کی ایک خاص تجویز کے لئے کسی مناسب عورت کو تلاش کرے۔

"کیا تم ہوائی جہاز پر اٹلانٹک پار کرنے پر تیار ہو۔" —— ایمیلیا کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر اس نے سادگی سے جواب دیا۔ "ہاں" نیو یارک میں اسے پتہ چلا کہ یہ فوکر ہوائی جہاز جس پر اسے اٹلانٹک پار کرنا تھا لندن کی مسز فریڈرک گیسٹ کا تھا۔ جو خود اس پر اٹلانٹک کو عبور کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے خاندان نے اسے

اس سے باز رکھا۔ مسز گسیٹ اب بھی چاہتی تھی کہ اٹلانٹک کو عبور کرنے کی یہ پرواز مکمل ہو کے رہے۔ اور ایک عورت اس ہوائی جہاز پر ہو جو امریکہ کی نسوانیت کا اچھا نمونہ ہو۔ مسز گیسٹ اس سفر کے اخراجات برداشت کرنے کو تیار تھی۔ اس نے جہاز کا نام "دوستی" رکھا تاکہ وہ انگلستان اور امریکہ کی دوستی کا نمونہ ہو۔ اس جہاز کا پائیلٹ بِل اسٹلٹز تھا اور اس کا میکانک لُو گارڈن تھا۔ یہ تجاویز راز میں تھیں عام طور پر سب یہی سمجھتے تھے کہ یہ ہوائی جہاز رچرڈ برڈ کی ملکیت ہے جو پہلے اس کا مالک تھا۔ اور وہ اس پر قطب جنوبی جانا چاہتا ہے۔ "اے۔ ای" بوسٹن کے ہوائی میدان پر کہیں نظر نہیں آئی۔ وہاں سفر کے لئے جہاز کو تیار کیا جا رہا تھا اور اندیشہ تھا کہ اگر اس کی پرواز کی زیادہ تشہیر ہو تو پرواز میں دیر لگ جائے گی یا کوئی اور پیچیدگی پیدا ہو جائے گی۔

"دوستی" کے دونوں پروں کی مجموعی لمبائی بہتّر فیٹ تھی۔ اس میں رائٹ وہرل ونڈ کمپنی کے بنے ہوئے ۲۲۵ ہارس پاور کے تین انجن لگے تھے۔ ہوائی جہاز پر نارنجی رنگ تھا۔ اور پروں کا رنگ سنہرا تھا۔ ان رنگوں کو خوبصورتی کے لئے نہیں بلکہ عملی نقطۂ نظر سے انتخاب کیا گیا تھا۔ نارنجی رنگ اور رنگوں کے مقابلے میں بہت دور سے نظر آ جاتا ہے۔ اور اگر جہاز کو پانی پر اترنا پڑتا تو یہ رنگ کارآمد ثابت ہوتا۔ جہاز میں "پون ٹون" لگے تھے جو اس سے پہلے کسی تین انجنوں والے ہوائی جہاز میں نہیں لگائے گئے تھے۔ ... وگیلن پٹرول لے جانے کی تجویز تھی۔ جس کے لئے کیبن میں مزید ڈبّے لگائے گئے تھے۔

مئی ۱۹۲۸ء میں یہ جہاز اڑنے کے لئے تیار ہو گیا۔ تین مرتبہ پائیلاٹ میکانک اور اے۔ ای تھرماس اور سینڈوچ لئے ہوئے گئے لیکن تینوں بار ہوائی جہاز ایسٹ بوسٹن کے ہوائی میدان سے جو خلیج کے اس پار تھا پرواز نہ کر سکا

ہوا بہت کم تھی اور کہر بہت زیادہ چھائی ہوئی تھی۔ بالآخر اتوار کی ایک صبح کو، طلوعِ آفتاب سے پہلے "دوستی" نے پرواز کی اور نیوفاؤنڈلینڈ کا رخ کیا کیونکہ جہازرانوں کا ارادہ تھا کہ وہاں سے اٹلانٹک کے پار پرواز کریں۔ تیرہ روز تک انہیں نیوفاؤنڈلینڈ کے ایک چھوٹے سے گاؤں ٹری پاسی میں گذارنے پڑے تاکہ جب موسم مناسب ہو تو پرواز کریں۔ یہ انتظار کی گھڑیاں بڑی سخت تھیں۔ بالآخر وہ دن آگیا کہ اٹلانٹک کا موسم اچھا تھا۔ اور ٹری پاسی کی بندرگاہ پر کہر بالکل نہ تھی۔ ... گیلن پٹرول کے علاوہ اور ہر چیز کو چھوڑ کے اور سمندر پر کئی بار مشق کے لئے پرواز کر کے یہ لوگ روانہ ہوگئے۔ ۱۷ جون ۱۹۲۸ء کو صبح کے گیارہ بج کر پندرہ منٹ پر "دوستی" نے اٹلانٹک کے پار وہ پرواز شروع کی جس کا عرصہ سے انتظار تھا۔ "اے۔ آئی" پائیلٹ کے پیچھے پٹرول کے ڈبوں کے درمیان بیٹھی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس سفر میں خود کچھ عرصہ کے لئے ہوائی جہاز چلائے لیکن بل اسٹلٹز کو اس کے مقابل ہوابازی کا زیادہ تجربہ تھا۔ اور چونکہ کہر بہت گہری تھی اس لئے اسی کو سارے راستے ہوائی جہاز چلانا پڑا۔

آٹھ بجے رات کو ریڈیو بند ہوگیا۔ اب وہ اپنی جگہ کا پتہ چلانے کے لئے جہازوں کو ریڈیو کے ذریعے پیغام نہ بھیج سکتے تھے۔ ان کا رخ آئرلینڈ کی جانب تھا۔ پٹرول کم ہوتا جا رہا تھا۔ اتنے میں کہر کے بادلوں کے درمیان انہوں نے سمندر پر ایک بڑے سے جہاز کو دیکھا۔ ان کے حساب سے وہ جہاز بھی اسی طرف جا رہا تھا جدھر وہ جا رہے تھے۔ ہوائی جہاز اس جہاز پر چکر لگانے لگا بل اسٹلٹز نے ایک چٹھی لکھی۔ اے ای نے اس کو ایک تھیلی میں رکھ کے وزن کے لئے ایک سنگترہ سے باندھا اور شگاف سے نیچے پھینک دیا۔ لیکن یہ اور ایسی اور کئی کوششیں بے کار گئیں۔ وہ یہ سوچ رہے تھے کہ اس جہاز کے

قریب سمندر پر اتر جائیں لیکن ہوائی جہاز کے اس عملے نے طے کیا کہ اگرچہ بہت تھوڑا پیٹرول رہ گیا ہے لیکن آگے ہی چلنا چاہیئے۔ آدھ گھنٹے بعد انہوں نے دو چھوٹی چھوٹی ماہی گیروں کی کشتیاں دیکھیں۔ پھر اور ماہی گیروں کی کشتیاں اور انہیں یقین ہو گیا کہ زمین دُور نہیں۔ چند میل تک ساحل کے ساتھ ساتھ چلنے کے بعد وہ ایک چھوٹے سے قصبے کے قریب پہنچے اور یہاں اتر گئے۔ یہ قصبہ ویلز کا بری پورٹ تھا۔ انہوں نے بیس گھنٹے اور چالیس منٹ میں اٹلانٹک کو پار کیا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ایک عورت نے اٹلانٹک کے پار پرواز کی تھی۔ یہ لمبی دبلی سی عورت تھی۔ جس کے بال پریشان تھے۔ اور جو سواری کی برجس پہنے تھی۔ اتنے اہم سفر میں اس کا کل زادِ راہ۔ دو تولیوں، ایک دانتوں کے برش اور ایک کنگھی پر مشتمل تھا۔ بری پورٹ سے وہ لوگ دوسرے دن پرواز کر کے ساؤتھمپٹن پہنچے۔ اور وہاں اخباروں کے نمائندوں اور حکومت کے افسران نے ان کا استقبال کیا۔ لندن میں ان کی ضیافتیں ہوئیں۔ اور اے۔ای نے محسوس کیا کہ اب اسے شہرت حاصل ہو چکی ہے۔

اے۔ای کہتی رہی کہ وہ تو اس ہوائی جہاز پر محض ایک مسافر تھی اور اگر کوئی تحسین کا مستحق ہے تو وہ مرد ہیں جو اس کو چلا رہے تھے۔ یا پھر مسز گیسٹ جن کی وجہ سے یہ پرواز ممکن ہو سکی۔ لیکن لندن میں دس دن تک، جب تک وہ رہی روز بے شمار تار خط اور دعوت نامے آتے۔ اس لئے جب امریکہ واپسی کے سفر کے لئے وہ پریسیڈنٹ روزولٹ نامی جہاز میں سوار ہوئی تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ گھر پہنچ کے پھر دعوتوں، ملاقاتوں اور تقریروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اتنی دعوتیں آئیں کہ وہ انہیں قبول نہ کر پاتی۔ شہرت کی پہلی موج کے بعد اس سے ایک کتاب لکھنے کی فرمائش کی گئی۔ جس میں وہ اس سفر کا حال لکھے اور ہوابازی

کے متعلق اپنے خیال کا اظہار کرے۔ اس نے یہ کتاب لکھی اور اس کا نام "بیس گھنٹے چالیس منٹ" رکھا۔ یہ ۱۹۲۸ء کے موسم خزاں میں شائع ہوئی۔ اس نے اپنی کتاب میں زور دیا کہ عورتیں ہوابازی میں بڑا نمایاں حصّہ لے سکتی ہیں۔ اور اس عہد میں جو تعصب عورتوں کے خلاف تھا کہ وہ ہوائی جہاز نہیں چلا سکتیں اس نے اس کی مذمت کی۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ اگر عورتیں ہوائی جہاز چلانے سے نہ ڈریں اور اگر اپنے شوہروں اور لڑکوں کو ہوابازی کا پیشہ اختیار کرنے سے نہ روکا کریں تو ہوائی جہازوں کے ذریعے سفر۔ ڈاک اور سامان بھیجنا بہت سہل ہو جائے گا۔

اٹلانٹک کے سفر کے بعد امیلیا ایرہارٹ کو کئی جگہ سے نوکریاں پیش کی گئیں۔ رسالہ "کوسموپولی ٹن" کے ایڈیٹر نے اسے ہوابازی کے حصّے کی ایڈیٹر مقرر کیا۔ اس نے ہوابازی کے متعلق اس رسالے میں بہت مضامین اور لوگوں کے استفسارات کے جواب لکھے۔ اسی زمانے میں وہ ٹرانس کانٹی نینٹل ایر ٹرانسپورٹ کے تجارتی شعبے میں بھی کچھ کام کرتی تھی اور مسافروں کے آرام و آسائش کا بندوبست کرتی تھی۔ وہ یہاں کام کر رہی تھی کہ اس کی ملاقات جین وڈال اور پال کولنس سے ہوئی۔ اور ان کی شرکت سے اس نے ایک کمپنی بنائی جس کے ذریعے واشنگٹن اور نیویارک کے درمیان ہر گھنٹے میں ایک بار پرواز ہوتی تھی۔ اے۔ ای اس کمپنی کی وائس پریسیڈنٹ بن گئی۔ اور اس حیثیت میں وہ ساری ریاستہائے متحدہ امریکہ میں لکچر دینے لگی۔

اے۔ ای ہر سال کئی میل اپنے ہوائی جہاز میں سفر بھی کرتی۔ گویا وہ اپنے ہوائی جہاز کو موٹر کی جگہ استعمال کر کے ایک قصبے سے دوسرے قصبے لکچر دینے جاتی۔ اگست ۱۹۲۹ء میں ملک کے آر پار عورتوں کی ہوائی دوڑ میں اس کا تیسرا نمبر رہا۔

۱۹۳۱ء میں امیلیا ایرہارٹ کی شادی جارج پامر پٹنام نامی ایک شخص سے ہوئی جسنے

"دوستی" کی پرواز کا انتظام کیا تھا۔ اور جو بعد میں بھی اس کی ہوابازی کی مصروفیتوں کا منتظم رہا۔ لیکن شادی کے بعد بھی اس کی مصروفیتیں وہی رہیں۔ وہ اپنے آبائی نام ہی سے مشہور رہی کیونکہ اس نام کو ایک خاص اہمیت حاصل ہو گئی تھی اے۔ ای کو اس کا یقین تھا کہ اگر شادی کے بعد بھی عورت اپنی فنی زندگی نہ چھوڑے تو شادی شدہ زندگی کو اور خوشگوار بنا سکتی ہے۔ کیونکہ اگر کسی کا دائرہ عمل وسیع ہو تو وہ گھر بار، محبت اور رفیقِ زندگی کی رفاقت کی اور زیادہ قدر کر سکتا ہے۔

۱۹۳۲ء کی ایک صبح کو جب یہ دونوں رائی نیویارک میں بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ ایمیلیا نے اخبار کے اوپر سے سر اٹھا کے کہا، "اگر میں اٹلانٹک پر اکیلی پرواز کروں تو آپ اس میں کوئی حرج تو نہیں سمجھیں گے۔" "دوستی" کی پرواز کے بعد سے اے۔ ای کی برابر یہی تمنا تھی کہ وہ اکیلی اپنے ہوائی جہاز پر اٹلانٹک کے پار پرواز کرے۔ ۱۹۲۸ء سے اب تک اسے ہوابازی کا مزید تجربہ ہو چکا تھا اور اب اس کا ہوائی جہاز لاک ہیڈ ویگا کمپنی کا بنا ہوا تھا۔ جو زیادہ مسافت کی پرواز کے لئے بہت موزوں تھا۔ ناشتہ پر اس گفتگو کے بعد اے۔ ای کئی کئی گھنٹے اوزاروں کا مطالعہ کرتی رہتی۔ کیونکہ اٹلانٹک کے سفر میں خراب موسم میں ہوا باز کو صرف اوزاروں کے سہارے پرواز کرنی پڑتی ہے۔ اس نے ایک نئی واسپ موٹر خریدی اور اب پھر اے۔ ای اٹلانٹک پر پرواز کے لئے اچھے موسم کا انتظار کر رہی تھی۔

اس مرتبہ وہ ہاربر گریس نیو فاؤنڈ لینڈ سے ۲۰ مئی ۱۹۳۲ء کو شام کے وقت روانہ ہوئی۔ آسمان صاف تھا چند گھنٹوں تک وہ بارہ ہزار میل کی بلندی پر پرواز کرتی رہی۔ دفعتاً، اس کی بارہ سال کی ہوابازی کی زندگی میں پہلی بار اس کے ہوائی جہاز کا بلندی ناپنے کا آلہ خراب ہو گیا۔ اور اس کے دونوں کانٹے بے کار ہو کے لٹکنے لگے۔ وہ سمجھ گئی کہ اب باقی سفر میں محض اپنی اٹکل سے اسے پانی سے

اوپر اپنے ہوائی جہاز کی بلندی کا تعین کرنا ہوگا۔ گیارہ بجے رات کو چاند غروب ہوگیا۔ ایک طوفان آیا اور اس نے اوپر کی طرف پرواز کی لیکن جلد ہی اس نے دیکھا کہ پروں پر برف جم رہی ہے۔ اور ہوائی جہاز بوجھل ہو رہا ہے۔ اس نے پھر نیچے غوطہ لگایا اور دیکھا کہ نیچے سمندر کی لہریں تھیں۔ اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو لرز گئی کیونکہ اس کے انجن کے ایک حلقے سے آگ نکل رہی تھی۔ اگر دھات جل جاتی تو خاتمہ ہو جاتا مگر دھات وزنی تھی، اور اس کا امکان تھا کہ وہ زمین تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے۔ جیسا کہ اس نے بعد میں بتایا اس نے سوچا کہ کچھ کیا ہی نہیں جا سکتا، اس لئے وہ رات بھر پرواز کرتی رہی۔ وقت گزرتا گیا۔ دن نکل آیا، اب بھی شعلے نکل رہے تھے۔ اسے ہوا میں چودہ گھنٹے ہو چکے تھے۔ اب اس نے دیکھا کہ جو تیل کے ٹینک محفوظ تھے وہ بھی ٹپکنے لگے تھے اب اسے اترنا ضروری تھا۔ مشرق کی طرف اس نے آئرلینڈ کے کونے کا رخ کیا۔ اور ہار بر گریس سے نکلنے کے چودہ گھنٹے چھپن منٹ بعد وہ لنڈن ڈیری کے ایک سبزہ زار پر اتر آئی اور گائیں اور چرواہوں کی لڑکیاں اس اعجوبہ کو حیرت سے دیکھنے لگیں۔

پرواز کامیاب رہی تھی۔ اس سے پہلے صرف ایک شخص نے تن تنہا اٹلانٹک کو پار کیا تھا۔ وہ پہلی انسان تھی جس نے دو مرتبہ اٹلانٹک کو ہوا کے ذریعے عبور کیا تھا۔ انگلستان میں اسے ہوا بازوں اور جہاز رانوں کی برطانوی انجمن کی اعزازی رکنیت کی سند دی گئی۔ اس سے پہلے صرف ایک غیر برطانوی کو یہ اعزاز بخشا گیا تھا اے۔ ای پہلی اجنبی خاتون تھی جس کا فرانس کی سینٹ نے سرکاری طور پر استقبال کیا۔ پیرس میں اسے لیجن آف آنر کی صلیب کا تمغہ دیا گیا۔ برسلز میں بلجیم کے بادشاہ اور ملکہ نے اسے شرف ملاقات بخشا اور اسے شاہ لیوپولڈ کی صلیب کا تمغہ عطا کیا

جب امریکہ واپس آئی تو وہائٹ ہاؤس کے ایک ڈنر کے بعد اسے نیشنل جیوگرافک سوسائٹی نے ایک طلائی تمغہ دیا۔ امریکہ کے پریسیڈنٹ کی تقریر کا جواب دیتے ہوئے اس نے کہا کہ اس کے کارنامہ پر جو قدردانی ہوئی ہے وہ کارنامہ سے کہیں زیادہ ہے۔ اسے یہ امید ہے کہ اب لوگ یہ جاننے لگیں گے۔ کہ ہوابازی میں عورتیں بھی کسی طرح مردوں سے کم نہیں رہ سکتیں۔ پرواز کے علاوہ دوسرے شعبوں میں بھی اے۔ ای عورتوں کے حقوقِ مساوات پر زور دیتی اس کے ایسے بیانات "مزے کی باتیں" نامی کتاب میں درج ہیں۔ یہ اس کی دوسری تصنیف تھی جو ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔

اٹلانٹک کی پرواز کے بعد ۱۹۳۵ء میں اس نے تن تنہا ہونولولو سے اوک لینڈ کیلی فورنیا تک پرواز کی۔ وہ پہلی عورت تھی جس نے ہوائی جہاز سے امریکہ تک پرواز کی۔ تین ماہ بعد اس نے بربنک کیلی فورنیا سے مکسیکو شہر تک اور پھر راستے میں کہیں ٹھہرے بغیر مکسیکو شہر سے نیوارک تک (جو نیویارک کے قریب واقع ہے) پرواز کی

نومبر ۱۹۳۵ء میں اے ای کے لئے ایک نیا میدان کھلا ۔۔۔ اسے پرڈوے میں وقتی طور پر پڑھانے کا موقع ملا۔ جہاں وہ لڑکیوں کو سال میں ایک ماہ پیشے اور ہنر انتخاب کرنے اور ہوائی تعلیم میں مدد دیتی۔ پرڈوے کی یونیورسٹی کا پریسیڈنٹ ایلیٹ، امیلیا کی کارگذاری سے اس قدر خوش ہوا۔ کہ اپریل ۱۹۳۶ء میں اس نے اعلان کیا کہ ہوابازی کی تحقیق کے لئے پچاس ہزار ڈالر کا ایک فنڈ امیلیا ایرہارٹ کے نام پر قائم کیا جائے، اس کے علاوہ اسے ایک لاک ہیڈ الکٹرا طیارہ اس کی کارگزاری پر تحفتاً دیا گیا۔ وہ اس ہوائی جہاز کو پا کے بہت خوش ہوئی۔ اور چاہتی تھی کہ ایک

سال تحقیق کے کام میں گزار دے۔ اس کے بعد پھر کہیں دور کا ہوائی سفر کرے لیکن پھر اس نے یہ بہتر سمجھا کہ پرواز پہلے کرلے۔ اس مرتبہ اس نے خطِ استوا کے اوپر اوپر مشرق سے مغرب کی جانب دنیا کے اطراف پرواز کرنے کا منصوبہ باندھا۔ یہ کل ستائیس ہزار میل کا سفر تھا۔ کئی مہینے کی منصوبہ بندی اور تیاری کے بعد وہ اوک لینڈ کیلی فورنیا سے ۱۷ مارچ کی سہ پہر کو روانہ ہوئی۔ اس کے ساتھ دو اور آدمی تھے لیکن جب وہ ہونولولو سے نکل رہی تھی۔ جہاں وہ اس سفر میں پہلی مرتبہ اتری تھی۔ اس کا بھاری ہوائی جہاز کیچڑ سے بھرے ہوئے میدان میں ٹوٹ گیا۔ "الیکٹرا" (یہ ہوائی جہاز کا نام تھا) مرمّت کے لئے کیلی فورنیا واپس بھیجا گیا۔ یہاں جب مرمت ہوچکی تو اے۔ ای پھر دنیا کے سفر کے لئے تیار ہوگئی۔ مگر اب اس نے ارادہ کیا کہ مغرب سے مشرق کی جانب سفر کیا جائے۔ وہ اوک لینڈ سے اڑ کے میامی پہنچی۔ جہاں آخری تیاریوں اور احتیاطی تدابیر کے بعد ایمیلیا ایرہارٹ، اور اس کا جہازران فریڈ نونان صبح سویرے ہوا میں بلند ہوئے۔ نکلنے سے پہلے اس نے ایک اخبار نویس سے کہا تھا کہ یہ اس کی آخری طویل پرواز ہوگی۔ وہ کہنے لگی کہ مجھ میں اتنی ہی سکت باقی رہ گئی ہے کہ ایک مرتبہ اور ایک طویل خطرناک پرواز کرلوں۔ ممکن ہے اسے اندر سے یہ محسوس ہوگیا ہو کہ یہ ہوائی جہاز لوٹ کے نہیں آئے گا۔ اس کے ایک ماہ بعد بحرالکاہل کے جزیرے ہاولینڈ کے قریب اس کی آخری پرواز میں یہ طیارہ تباہ ہوگیا۔

اے۔ ای نے اپنے شوہر سے کہا تھا کہ جب مرنے کا وقت آئے تو خدا کرے میں آناً فاناً اپنے ہی ہوائی جہاز میں ختم ہوجاؤں۔ اپنے لڑکپن میں

وہ کہا کرتی تھی کہ میں ہر چیز کو بہر حال ایک بار آزما کے دیکھنا چاہتی ہوں - دو مرتبہ اس نے دنیا کے اطراف پرواز کرنے کی کوشش کی - اپنے اس مقصد میں وہ کامیاب نہ ہو سکی - لیکن اس نے کبھی ہمّت نہ ہاری - اس کی زندگی اور اس کے کارناموں سے آنے والی نسلوں کی ہمّت بندھے گی. صرف ہوا بازوں ہی کی نہیں بلکہ ان عورتوں کی بھی جو دوسرے میدانوں میں پیش قدمی کریں گی ؛

ہیلن کیلر

مُصنّفہ

سنہ ۱۸۸۰ء تا سنہ ء

ہیلن کیلر جو نابینا ہونے کے باوجود امریکہ کی باہمت خواتین کی نمایاں مثال سمجھی جاتی ہے۔ الاباما کے چھوٹے سے قصبے ٹس کمبیا میں ۲۷ جون سنہ ۱۸۸۰ء کو پیدا ہوئی۔ اس کا باپ آرتھر۔ ایچ۔ کیلر جنوبی ریاستوں کی فوج میں کپتان تھا اور میری لینڈ اور ورجینیا کے پہلے پہل آباد ہونے والے باشندوں کی نسل سے تھا ہیلن کی ماں کیٹ آڈمز، نیوبرگ ماسوچوسیٹس کے آڈمز خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اور اس کے مشہور رشتہ داروں میں ایڈورڈ ایورٹ اور ایڈورڈ ایورٹ ہیل شامل تھے۔

ہیلن کے پہلے پانچ سال کیلر کے بیلوں سے ڈھکے ہوئے مکان میں بسر ہوئے یہ مکان ہی بیلوں والا مکان کہلاتا تھا۔ مکان کے چاروں طرف باغ میں گلاب اور جنوب کے دوسرے خوشبودار پھولوں کے تختے تھے۔ ہیلن دوسرے بچوں کی طرح ایک سال کی عمر میں چل لیتی۔ اور کچھ الفاظ بول لیتی تھی اس کے والدین اسے دیکھ دیکھ کے خوش ہوتے۔ کیونکہ وہ بچپن میں چلبلی اور شریر تھی۔ لیکن جب وہ انیس مہینے کی ہوئی تو اس پر ایک ایسے مرض کا حملہ ہوا جس کی وجہ سے اس کا معدہ اور اس کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ وہ اچھی ہوتی گئی لیکن اسے بڑا نقصان یہ پہنچا کہ وہ ہمیشہ کے لئے اندھی اور بہری ہو گئی۔ جس حالت میں وہ کچھ سن ہی نہ سکتی تھی۔ چند الفاظ جو وہ بولنے لگی تھی وہ بھی بھول گئی۔ اور اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ اپنی آواز سے

کوئی کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ عجیب وغریب تاریکی اور خاموشی اس ننھی سی بچی کو ہراساں کئے رہتی۔ کیونکہ وہ ابھی اتنی چھوٹی تھی کہ اپنی بیماری کو نہ سمجھ سکتی تھی۔ شروع شروع میں تو وہ بہت اداس رہتی لیکن پھر وہ اپنے ہاتھ سے ٹٹول کر اور سونگھ کر دنیا کی دوسری اشیاء کو سمجھنے لگی۔ وہ چنبیلی کی خوشبو کی وجہ سے اس کے پھولوں کو پہچان لیتی۔ وہ باغ کی باڑھ کو خود اپنے ہاتھ سے ٹٹول ٹٹول کے باغ کے اطراف چکّر لگاتی۔ پانچ سال کی عمر میں اسے بتایا گیا کہ جو کپڑے دھل کے آئیں انہیں کس طرح تہہ کر کے رکھنا چاہیئے۔ اُس کی قوّتِ لمس اتنی ترقی کر گئی کہ وہ فوراً اپنے کپڑوں اور دوسروں کے کپڑوں میں تمیز کر لیتی۔

وہ کئی کئی گھنٹے حبشی باورچی کی ننھی سی لڑکی مارتھا واشنگٹن کے ساتھ گزارتی اور "بیل" جو اُن کا پرانا کتّا تھا ان دونوں بچّوں کو لمبی لمبی گھاس میں مرغی کے انڈے ڈھونڈھنے میں مدد دیتا۔ اگر موسم گرم اور صاف ہوتا تو دونوں بچّیاں باہر کھیلتیں، یہیں باہر کھیلتے ہوئے ہیلن نے فطرت کو عجیب وغریب طریقے پر سمجھنا اور اس کی قدر کرنا شروع کیا۔ ہیلن اپنی گڑیوں کو بہت چاہتی تھی۔ اور خاص کر اس گڑیا کو جس کا نام نینسی تھا۔ نینسی سے وہ محبّت بھی کرتی اور کبھی کبھی اس پر غصّہ بھی کرتی لیکن بچپن کے تخیّل نے اس کے لئے جو نعمتیں جمع کر دی تھیں ان کے باوجود ہیلن ہر وقت بے چین اور اکثر بیزار رہتی کیونکہ اس خاموشی اور تاریکی سے وہ اکتا گئی تھی۔

ہیلن کی ماں اپنی بچّی کی اس معذوری کے باعث بہت افسردہ رہتی۔ چارلز ڈکنز کے سفرنامے "امریکی روزنامچے" میں اس نے بوسٹن کے ڈاکٹر سموئیل گرڈلے ہو کا حال پڑھا جس نے ایک بہری اور اندھی عورت کو پڑھنا لکھنا سکھایا تھا۔ اس نے فوراً ہی اس غیر معمولی آدمی کا سراغ لگانے کی کوشش شروع کر دی۔ لیکن

اسے یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ دس سال پہلے اس شخص کا انتقال ہو چکا تھا۔

جب ہیلن چھ سال کی ہوئی تو اس کے والدین اسے بالٹی مور کے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گئے، مگر وہ اس کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ پھر بھی والدین نے ہمت نہ ہاری۔ اور اس کی سفارش پر واشنگٹن کے ڈاکٹر گراہم بیل سے مشورہ کیا۔ ڈاکٹر بیل نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ فوراً بوسٹن میں نابیناؤں کے پرکنس انسٹی ٹیوٹ کو خط لکھ کے ہیلن کے لئے ایک استانی کو بلالیں۔ آخر والدین کو اطمینان ہوا کہ ان کی مشکلیں کچھ تو حل ہوئیں۔ انہوں نے اسکول کو خط لکھا اور انہیں کامیابی ہوئی کیونکہ بہت جلد این مینس فیلڈ سلی ون آگئی اور آئیوی گرین میں ہیلن کو تعلیم دینے لگی۔

مس سلیون بڑی غیر معمولی نوجوان عورت تھی۔ چودہ سال کی عمر میں جب وہ پرکنس انسٹی ٹیوشن آئی تھی تو قریب قریب اندھی تھی۔ اس کے بعد ایک حد تک اس کی بینائی درست ہوگئی۔ اور جب سند لے چکی تو اس نے تہیہ کر لیا کہ اپنی عمر ایسے لوگوں کی خدمت میں بسر کرے گی جو اسی کی طرح مصیبت میں مبتلا ہیں۔ ہیلن کی زندگی میں وہ دن بڑا اہم تھا جب یہ بیس سالہ استانی آئی اور اس دن کو وہ کبھی نہ بھول سکی۔ دونوں نے ایک ہی طرح کی مصیبت اٹھائی تھی۔ اس لئے استانی اپنی شاگرد کی تکلیف کو خوب سمجھتی تھی۔ اور بڑے صبر و استقلال سے اس نے اس ننھی سی بچی کو تعلیم دینا شروع کیا تھا جس کا ساری دنیا سے رشتہ ٹوٹ چکا تھا، جو بصارت و سماعت کے ذریعے عام طور پر قائم رہتا ہے۔

مس سلی ون اپنے ساتھ ایک ایسی گڑیا لائی تھی جسے انسٹی ٹیوٹ کے اندھے بچوں نے بنایا تھا۔ اس نے اپنے سبق کے لئے اسی گڑیا کو استعمال کیا۔ اس نے گڑیا کو بچی کی گود میں دے کر اس کی انگلی پکڑ کے یہ حروف بنائے

گ ڑ ی ا ۔ پہلے پہل تو ہیلن اس کا مطلب نہیں سمجھی، لیکن یہ نیا کھیل اسے پسند آیا اور وہ اپنی ماں کو یہ کھیل دکھانے کے لئے دوڑی دوڑی نیچے گئی۔ مس سلی ون مستقل مزاجی سے اسے سکھانے کی کوشش میں لگی رہی اور تھوڑی دیر کے بعد اسے کامیابی ہوئی۔ اس نے باغ کے نل سے ہیلن کے ہاتھ پر پانی ڈال کے اس کی ہتھیلی پر یہ حروف بنائے پ ۔ ا ۔ ن ۔ ی ہیلن کے چہرے پر روشنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور اب وہ مختلف اشیاء اور ان حرف کی لکیروں کا تعلق سمجھنے لگی۔ پہلا مقصد پورا ہو گیا۔ ہیلن نے خود بڑی خوشی سے کئی مرتبہ "پانی" کے ہجے لکھے۔ اور پھر اس نے زمین، اور نل وغیرہ کی طرف اشارے کئے اور ان کے نام اُسے بتائے گئے۔ دفعتاً اس نے پلٹ کے اشارے سے اپنی ساتھی کا نام پوچھا۔ اس کی ہتھیلی پہ لفظ "استانی" لکھ دیا گیا۔ یہ کھیل گھنٹوں جاری رہا۔ اس اثناء میں ہیلن نے تیس لفظوں کے ہجے یاد کر لئے۔ یہ بڑی کامیابی کا دن تھا۔ وہ نئے نئے سبق تیزی سے یاد کرنے لگی۔ وہ ذہین تھی جلدی سیکھ جاتی۔ تین مہینے میں اسے تین سو لفظ اور کئی عام جملے یاد ہو گئے۔ چار مہینے بعد گرمیوں کے اختتام پر اسے چھ سو پچیس الفاظ یاد ہو گئے۔ مس سلی ون کے لئے اپنی اس ذہین شاگرد کی ذہانت کا ساتھ دینا مشکل ہو گیا۔

بڑی ہوشیاری اور بے انتہا صبر و استقلال سے رفتہ رفتہ لڑکی کے ذہن کی نشو و نما کی گئی۔ مس سلی ون نے ہیلن کے غیر معمولی حسِ لمس سے فائدہ اٹھایا۔ دونوں مل کر چکنی مٹّی سے ابھرے ہوئے نقشے بناتیں اور ہیلن کا بے پناہ تخیّل چھوٹی چھوٹی لفظی تصویروں میں بند، دریا، جھیلیں اور جزیرے بناتا۔ اس وقت اس کے خواب و خیال میں بھی نہ آیا تھا کہ یہ دلچسپ کھیل جو مس سلی ون اسے کھیلنا سکھا رہی تھی۔ اسے دنیا اور زندگی کے سبق سکھا رہے تھے۔

مس سلی ون نے ایک خط میں لکھا: "وہ ان چوزوں میں بڑی دلچسپی لے رہی ہے جو انڈوں کو ٹھنگ ٹھنگ کر کے باہر نکل رہے ہیں۔ میں نے ایک انڈا اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور اس نے چوزے کے ٹھنکنے کی آہٹ اپنے ہاتھ سے محسوس کی۔ جب اس نے انڈے کے اندر اس چھوٹے سے چوزے کو پایا تو اسے جتنی کچھ حیرت ہوئی وہ میں اس خط میں بیان نہیں کر سکتی۔ مرغی بیچاری بڑی شریف تھی۔ اس نے ہماری تفتیش پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ چوزوں کے علاوہ گھر میں اور بہت سے باشندوں کا اضافہ ہوا ہے۔ دو بچھڑے۔ ایک گھوڑے کا بچہ۔ ٹوکرا بھر کے چھوٹے چھوٹے سؤر۔ آپ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ میں ایک سؤر کے چلاتے ہوئے بچے کو اپنی گود میں اٹھائے ہوں اور ہیلن اس پر ہر طرف سے ہاتھ پھیر کے طرح طرح کے سوال کر رہی ہے۔"

گھر کے باہر اور اندر سال بھر تک اس طرح کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ اور مس سلی ون کو جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ اب شاگرد کو پڑھانے لکھانے کا وقت آگیا ہے بریل پر چھپی ہوئی کتابیں منگوائی گئیں۔ اور اس کی تعلیم کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اب بھی ہیلن بڑی ہوشیار اور محنتی شاگرد ثابت ہوئی۔ اور بڑی آسانی اور جوش سے اس نے ابھری ہوئی تحریروں کو پڑھنا شروع کیا۔ جیسے ہی اسے پڑھنا لکھنا آگیا وہ خود خطوط لکھنے لگی۔ اس کے خطوط سے اس کی غیر معمولی سمجھ اور اس کے دلچسپ خیالات کا اندازہ ہوتا تھا۔ جب خود اس کے پاس کوئی خط آتا تو وہ اسے اپنے کتے بیل کے پاس لے جاتی اور اپنی انگلیوں سے سطور کا مطلب نکالتی۔ اور اس کی وجہ سے کتا خاموش پڑا رہتا۔

جب ہیلن کی عمر آٹھ سال کی ہوئی تو مس سلی ون نے طے کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ وہ دوسرے بچوں سے ملے۔ چنانچہ وہ اسے بوسٹن پرکنس انسٹی ٹیوشن

لے گئی۔ ہیلن کو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ اور بھی بچے ایسے تھے جو اسی کی زبان میں باتیں کرتے تھے۔ اور جب وہ گرمجوشی سے اس کا ہاتھ دباتے تو اسے محسوس ہوتا کہ اس کے اور ان کے درمیان ایک غیر مرئی رشتہ ہے۔

اسکول کی کلاسیں بھی گھر کی کلاسوں کی طرح دلچسپ تھیں۔ تاریخ کا پہلا سبق بنکر کی پہاڑی پر سکھایا گیا جہاں بچوں کو اس یادگار پر زینے گِن گِن کے چڑھنا پڑا۔ ایک جہاز پر پلائی متھ جاتے ہوئے ہیلن کو تاریخ میں "زائرِ اجداد" کا سبق سکھایا گیا۔ دن تیزی سے گزرتے گئے اور اسکول کی چھٹیاں شروع ہوئیں۔ گرما کی چھٹیاں اس نے کیپ کاڈ میں بروسٹر کے مقام پر گزاریں اور موسمِ خزاں میں وہ اور اس کی استانی دونوں الاباما واپس آئے۔ اس وقت ہیلی۔ استانی اور اس کی شاگرد کے درمیان ایک ایسا ربط قائم ہوگیا تھا کہ یہ محبت کا رشتہ عمر بھر باقی رہا۔ ہیلن کے لئے مس سلی وِن معجزے دکھانے والی اور مجسم مہربانی تھی۔ اور یہ بچی اپنی استانی کو دل وجان سے چاہتی۔ اور اس پر اعتماد کرتی تھی۔ ہیلن کے متجسس ذہن کی بدولت دونوں روزمرہ کی زندگی کے سرچشموں میں نئی سمجھ بوجھ اور نئے تجربے تلاش کرتیں۔ اور اس میں لطف و مسرت حاصل کرتیں۔ ہیلن کو زندگی سے جو دلچسپی پیدا ہوگئی تھی وہ اب اس کے بشرے سے نمایاں تھی۔ ایک آدمی نے اسے دیکھ کے کہا "میں نے اس سے پہلے بھی بہت سے بشاش چہرے دیکھے ہیں لیکن جیسی مسرت اور جیسا اطمینان میں نے اس بچی کے چہرے پر دیکھا ہے اس سے پہلے کسی کی صورت پر نہیں دیکھا تھا۔"

۱۸۹۰ء میں جب ہیلن دس سال کی تھی تو اس نے ایک لڑکی کے متعلق یہ سنا کہ وہ بہری ہے اور اس نے بات کرنا سیکھ لیا ہے۔ لوگوں کے ہونٹوں کے ہلنے کو محسوس کر کے اسے عرصہ ہوا یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ اور سب لوگ ایک

دوسرے سے محض نشانیوں کے ذریعے خطاب نہیں کرتے۔ بڑے جوش وخروش سے اس نے بات چیت کرنا سیکھنے کی کوشش کی۔ اس نے اس وقت تک چین نہ لیا۔ جب تک کہ اس کی استانی اُسے مس سارا فلر کے پاس نہ لے گئی۔ جو بہروں کے ہوریس مان اسکول کی پرنسپل تھی۔ اس نے بڑی خوشی سے اِس پرجوش شاگرد کو اپنے اسکول میں داخل کر لیا۔ ناکامی کا خیال بھی اپنے دل میں لائے بغیر ہیلن نے اپنے مشکل سبق یاد کرنے شروع کئے۔ اس کے دل میں یہ امنگ تھی کہ جب وہ جنوب کو واپس جائے تو اپنے ماں باپ کے ساتھ باتیں کرے۔ مس فلر نے آوازیں سکھانے کے لئے ہیلن کو اپنی زبان پر انگلی رکھ کے یہ بتانے کی کوشش کی کہ کس حرف کو ادا کرتے وقت زبان منہ میں کس مقام پر ہوتی ہے۔ گھنٹہ بھر کی ان تھک محنت کے بعد ہیلن خوشی کے مارے باغ باغ تھی کیونکہ اب وہ ابتدائی آوازیں جیسے م۔ پ۔ الف۔ س۔ ت اور ی ادا کر سکتی تھی۔ لیکن یہ سبق اس کی مجبوریوں کے لحاظ سے زیادہ دقیق اور مشکل تھے۔ ہیلن نے ہار نہیں مانی، وہ مسلسل مشق کرتی رہی، اور کھلونوں سے، پتھروں سے، چاند سے اور ہر کسی سے جو اس کی باتیں سنتا باتیں کرنے کی کوشش کرتی۔ رفتہ رفتہ اسے ان آوازوں پر عبور ہو گیا۔ گو صرف مس سلی ون اور مس فلر ہی اس کی باتوں کو سمجھ سکتی تھیں۔ ہیلن جانتی تھی کہ اب اس کی باتیں کرنے کی تمنا پوری ہو کے رہے گی۔ گیارہ سبقوں میں مس فلر کا کام مکمل ہو گیا۔ اور ہیلن جلدی سے ٹس کمبیا واپس آگئی سارا خاندان اسے لینے اسٹیشن گیا۔ اس کی ماں خوشی سے کانپنے لگی۔ اور ایک حرف بھی نہ کہہ سکی اور ایک ایک لفظ جو ہیلن کہتی سننے لگی۔ اس کی چھوٹی بہن ملڈرڈ خوشی کے مارے ناچنے لگی۔ اس کا باپ بھی بہت متاثر تھا اور فخر اور محبت کے عالم میں اس کی زبان سے بھی بات نہ نکل سکتی تھی۔

۱۸۹۳ء میں ہیلن کی بارہویں سالگرہ کے بعد دو اہم واقعات پیش آئے۔ جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی شخصیت کا رجحان کس طرف ہے۔ پہلے تو سہیلیوں کی ہمت افزائی کو دیکھ کر اس نے بوسٹن میں ایک چائے کی دعوت دی تاکہ ایک اور اندھی لڑکی کیلئے چندہ جمع کرے جو خود اتنی غریب تھی کہ اپنی تعلیم کے اخراجات برداشت نہ کر سکتی تھی۔ اس دعوت میں اس نے دو ہزار ڈالر سے زیادہ جمع کر لیئے تاکہ کمسن بچیوں کے لئے کینڈرگارٹن اسکول کھولا جائے۔ دوسرے یہ کہ اس زمانے میں اس کی پہلی تحریر شائع ہوئی۔ یہ اس کی اپنی زندگی کا حال تھا جو "یوتھ کمپینین" میں شائع ہوا۔ زندگی کی پختگی کے دور میں ہیلن کیلر نے اور بھی بہت سے فیاضی اور رفاہِ عام کے کام کئے۔ اور پڑھنے والوں نے آگے چل کے اور بھی بہت سی کتابیں پڑھیں۔ جن سے اس کی اندرونی اُپج اور اس کے شاعرانہ اظہار کی خوبیاں معلوم ہوتی ہیں۔

اس اثناء میں ہیلن، رائٹ ہماسن اسکول میں جو بہروں کے لئے تھا تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ یہاں اس نے غیر معمولی تیزی اور سرگرمی سے فرانسیسی اور لاطینی زبانوں پر عبور حاصل کر لیا۔ بولنے، اور آواز کی تربیت کے علاوہ اس اسکول میں حساب، طبیعی جغرافیہ، جرمن زبان اور دوسرے مضامین کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان سب مضامین کو اس نے کم و بیش کامیابی سے حاصل کیا۔ حساب اس کو دوسرے مضمونوں کے مقابل مشکل معلوم ہوا۔ اور وہ کہتی تھی اس میں جا بجا گڑھے ہیں۔ لیکن اسے زبانوں کو سیکھنے کا ڈھنگ آتا تھا۔ اور بہت جلد وہ خوب پڑھنے لکھنے لگی۔

اکتوبر ۱۸۹۶ء میں وہ نوجوان خواتین کے کیمبرج اسکول میں داخلے کی تیاری کر رہی تھی۔ یہاں سے وہ ریڈکلف کالج منتقل ہونا چاہتی تھی۔ یہ ثانوی اسکول ہیلن کے لئے زیادہ مشکل تھا کیونکہ جن کتابوں کی ضرورت تھی ان میں سے بہت کم بریل

دا بھرے ہوئے الفاظ) میں دستیاب ہو سکتی تھیں۔ لیکن اس کی کوششوں کی وجہ سے اس کی اُستانیاں بہت متاثر ہوئیں۔ استانیاں جو پڑھاتیں اس کا خلاصہ مس سلی دن اس کی ہاتھیلی پر لکھتی جاتی۔ روزمرہ کی مشق اور امتحان کے لئے وہ ٹائپ رائٹر سے کام لیتی جس پر ٹائپ کرنے میں اسے بڑی مہارت تھی۔

۱۹۰۰ء میں مس کیلر نے یونانی، لاطینی، جرمن، الجبرا اور جیومیٹری کے امتحانات پاس کئے اور ریڈکلف کالج میں داخل ہوئی۔ ڈین ارون کی صلاح تھی کہ وہ ایک خاص کورس لے لیکن یہ باہمت نوجوان خاتون اس ارادے سے باز نہ آئی۔ وہ بھی وہی کچھ سیکھنا چاہتی تھی جو اس کی ساتھ کی لڑکیاں سیکھ رہی تھیں۔

ریڈکلف کی کالج کی زندگی اس کے لئے بڑی بیش بہا ثابت ہوئی۔ یہاں مس کیلر نے علم حاصل کیا اور محنت کر کے لکھنے کی مشق کی۔ مایوسی کی حالت میں مستقل مزاج رہنا اس کا شیوہ تھا۔ اس نے اس کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:۔ "میں فوراً اپنی بے اطمینانی پر قابو پالیتی ہوں اور اپنے دل کو خوش کر لیتی ہوں۔ کیونکہ جس کسی کو علم حاصل کرنا ہو اسے ایک کٹھن پہاڑی پر چڑھنا پڑتا ہے۔ اور چونکہ چوٹی تک کوئی شاہراہ نہیں جاتی، اس لئے ہر ایک کو بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی پر سے ہو کر جانا پڑتا ہے۔ یہی حال میرا ہے۔ میں کہیں کہیں بھٹک جاتی ہوں، کبھی گر پڑتی ہوں، کبھی کھڑی کی کھڑی رہ جاتی ہوں۔ مجھے نامعلوم رکاوٹوں کی ٹھوکر لگتی ہے، مجھے غصہ آتا ہے اور از جاتا ہے۔ میں پھر غصہ نہیں آنے دیتی۔ میں کوشش کر کے پھر آگے بڑھتی ہوں اور کچھ اور اوپر چڑھتی ہوں اور کھلتی ہوئی فضا کو دیکھتی ہوں۔ ہر سعی دراصل فتح ہے۔ ذرا سی کوشش اور کروں تو چمکتے ہوئے بادلوں اور آسمان کی نیلی گہرائیوں تک پہنچ جاؤں۔ یہ وہ بلندی ہے جہاں تک پہنچنے کی مجھے تمنا ہے۔"

کالج میں اس نے چار سال بڑی مصروفیت میں گذارے، لیکن اس عرصہ میں بھی اس کی تخلیقی صلاحیت - اس کی دو کتابوں "میری زندگی کی کہانی" اور "رجائیت" کی شکل میں ظاہر ہوئی - ان کتابوں میں اس نے اپنے اس یقین کا اظہار کیا کہ مسرت اور شادمانی کی بدولت وہ اس قابل ہو سکی ہے کہ معاشرے کی خدمت کر سکے، وہ لکھتی ہے " مجھے معلوم ہے کہ میں بہت کم مفید کام کر سکتی ہوں لیکن جو کام میں کر سکتی ہوں اس کی کوئی انتہا نہیں - ممکن ہے کہ انگوروں کے باغ میں سب سے زیادہ خوش وہ مزدور ہو جو لنگڑا لولا ہے - دوسرے مزدور اس سے زیادہ محنت کرتے ہوں گے لیکن ہر سال جب انگور پکتے ہیں تو وہ اپنے ہاتھوں سے ان انگوروں کے خوشوں کو محسوس کرتا ہے - مجھے دوسروں کی نیکیاں اس لئے پسند ہیں کہ میں خود کوئی کارِ خیر کر سکوں یا نہ کر سکوں وہ جو سچے اور نیک ہیں ان کی نیکیاں اپنی جگہ پر قائم ہیں"۔ رجائیت کے متعلق جو اس کی زندگی کا فلسفہ ہے اس نے لکھا " وہ شخص جس کے دل میں امید و رجا ہے وہ پہچانتا ہے کہ ہر ایک کو زندہ رہنے کا، آزادی کا، مسرت کی تلاش کا اور صلح و آشتی کا حق حاصل ہے - وہ جانتا ہے کہ جو طاقت ور ہیں انہیں برضا و رغبت کمزوروں کے ساتھ رعایت کرنا چاہیئے صاحبِ روزگار کے حقوق میں بے روزگاروں کے حقوق پوشیدہ ہیں -

کالج سے ڈپلوما حاصل کرنے پر مس کیلر کی رسمی تعلیم ختم ہوئی مگر اس کی حقیقی تعلیم کا سلسلہ ختم نہیں ہوا - وہ بہترین انگریزی، فرانسیسی اور جرمن ادب پڑھتی رہی اور نئے جوش و خروش سے لکھتی رہی - اس کا بہت سا وقت ان لوگوں کی مدد میں صرف ہوتا جن کو مدد کی ضرورت تھی - اگر اُسے معلوم ہوتا کہ اس کی تقریر سے کسی کو فائدہ پہنچے گا تو وہ قطعاً نہ ہچکچاتی اور یہ خیال نہ کرتی کہ اس کی زبان اور اس کا لہجہ پختہ نہیں - اسی طرح رفاہِ عامہ کے کام یا کسی ادارے کی

قلمی امداد سے وہ کبھی گریز نہ کرتی۔ لیکن اس کی زیادہ تر کوششیں اپنی ہی طرح کے دوسرے بدنصیبوں یعنی اندھوں کی امداد کے لیئے وقف تھیں۔ وہ ان کی بڑی جانباز ساتھی تھی۔ اور ذاتی طور پر انہیں ہر طرح ہمّت دلاتی۔ وہ اندھوں کے ماسوچوسیٹس کمیشن کی رکن بنی۔ اور اندھوں اور بہروں کی کئی انجمنوں کی رکنیت اور مشیری اس نے قبول کی۔ مس کیلر اندھوں کی امداد کے لیئے زیادہ تر پرچار اپنی تحریروں کے ذریعے کرتی۔ گویا اس امر کا ثبوت دیتی کہ اگر باقاعدہ طریقے پر اور ذہانت سے اندھوں کی راہنمائی کی جائے تو وہ قابلِ عزّت۔ کار آمد اور اپنا بوجھ آپ سنبھالنے والے شہری بن سکتے ہیں۔

اس کی شہرت کے ساتھ ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ بڑھتا گیا۔ اس کے پاس ٹیکساس، اری زونا، جنوبی افریقہ، جاپان، سویڈن، ہندوستان، جرمنی، انگلستان اور اسپین سے درخواستیں اور شکریئے کے خطوط آتے۔ کوئی اس کی کتابیں ترجمہ کرنے کی اجازت مانگتا، کوئی کار ہائے خیر میں اس کی مدد مانگتا۔ کوئی اس کی ہمّت افزائی اور دور اندیشی کا شکریہ ادا کرتا۔ اندھے اکثر اس سے ہمدردانہ مشورہ مانگتے۔ وہ ہمیشہ ہر خط کا جواب دیتی۔

اس کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ وہ بہت عرصہ تک فلپس بروک سے خط و کتابت کرتی رہی جو اس کا بڑا قدر دان تھا۔ ان کے علاوہ اور مشاہیر کو خوب جانتی تھی مثلاً اکیور وینڈر ہومز، وہیٹیر، ہوول خاندان، مارک ٹوین اور ڈاکٹر ایڈورڈ ایورٹ ہیل اور بڑے ہونے کے بعد بھی سب سے زیادہ مسرت اور اطمینان اسے اپنی مہربان استانی این سلی ون کے ساتھ ہونے کی وجہ سے حاصل تھا۔

شہر کی گندی سڑکوں کے مقابلے میں اسے دیہات پسند تھے۔ اس لیئے وہ اور این سلی ون ماسوچوسٹس کے ایک چھوٹے سے قصبے ورین تھم میں رہنے لگیں۔ یہاں

وہ فطرت کی ہزاروں دھیمی دھیمی آوازوں سے دلچسپی لینے لگی۔ اپنی کتاب "جس دنیا میں میں رہتی ہوں" میں وہ شاعرانہ نزاکتِ احساس کے ساتھ لکھتی ہے "گھاس کی سرسراہٹ۔ سنگریزوں پر بہتے ہوئے پانی کی سریلی سی صدا" اور وہ آخر میں کہتی ہے۔ "پہلے میں نے ان کو لمس کے ذریعے محسوس کیا۔ اور اب مجھے یہ آوازیں سرسراتی ہوئی، گنگناتی ہوئی، پھڑپھڑاتی ہوئی اور بہتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اور ان سب کی وجہ سے میں خوش اور مسرور رہتی ہوں"۔

ساری دنیا اس بہادر اور باہمت عورت کو جانتی ہے جو شکست کے لفظ سے ناآشنا ہے جس نے کبھی کاہلی اور تساہل کو پاس نہ پھٹکنے دیا، اور جس نے بہری اور اندھی زندگی سے فن اور ہنر کی دولت اور زندگی کی بھرپور مسرت حاصل کی۔ اس کے رحم و کرم کا پیمانہ اتنا وسیع ہے کہ دنیا میں جتنے بھی دکھی اور بدقسمت لوگ ہیں خواہ ان کی بدقسمتی کا باعث کچھ ہی کیوں نہ ہو ان سب کے لئے اس کے دل میں جگہ ہے، وہ کہتی ہے کہ علم اور تعلیم ایسی دولتیں ہیں کہ ان سے کسی کو محروم نہ ہونے دینا چاہیئے۔ "ایک ہی تاریکی ایسی ہے جس میں روشنی کا نام و نشان نہیں اور یہ جہالت اور بے حسی کی رات ہے"۔

جن لوگوں نے اس کی کتابیں پڑھی ہیں یا جو ذاتی طور پر اس جگمگاتی شخصیت سے واقف ہیں یہ جانتے ہیں کہ اس کی اندھی آنکھیں بصیرت کی اس حد تک پہنچتی ہیں جہاں تک معمولی آنکھوں کی بصارت نہیں پہنچ سکتی۔ وہ لکھتی ہے "جب میں ٹٹول ٹٹول کے اپنے کمرے میں چلتی پھرتی ہوتی ہوں تو میری روح شاہین کے پروں پر پرواز کر کے آسمانی بلندی سے جاودانی حسن کا مشاہدہ کرتی ہے"۔ اس کی شخصیت بے مثل ہے۔ دنیا کو اس نے جو تحفہ دیا ہے وہ تازہ اور صحت مند روح ہے۔ اور اس کے ساتھ انسانوں کی بے حد و انتہا خدمت اور خود اپنی زندہ مثال جو دوسروں کی ہمت افزائی کرتی ہے۔

میری لی آن

معلّمہ

سنہ ۱۷۹۷ء تا سنہ ۱۸۴۹ء

امریکہ کے ماہرینِ تعلیم جن کی محنت و بلند خیالی نے ہمارے طرزِ تعلیم کی بنیادیں رکھی ہیں۔ ان میں میری لی آن کا نام صفِ اولین میں شامل ہے۔ انیسویں صدی کے شروع میں مردوں اور عورتوں کے لئے تعلیم کے یکساں موقعے فراہم کرنا ایک مہمل خواب کی سی بات معلوم ہوتا تھا۔ میری لی آن نے ایک تجویز کو سوچا اور اس کی تکمیل کی جس کی وجہ سے یہ خواب حقیقت میں بدل گیا۔ اس کام کو محض اس نے اپنی زبردست قوّتِ ارادی اور اپنے جوشِ عمل سے سرانجام دیا۔

میری کے سات بھائی بہن تھے۔ ان میں یہ پانچویں تھی۔ وہ ماسوچوسٹس کی مغربی پہاڑوں میں ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئی۔ اس کا باپ ہاروں لی آن صلح پسند خدادوست آدمی تھا۔ سارے ہمسائے اس کی عزّت اور اس سے محبت کرتے تھے۔ میری ابھی کم سن ہی تھی کہ اس کے والد کا انتقال ہوگیا۔ اب ساتوں بچّوں کی پرورش کا بار اس کی ماں مسز لی آن پر آن پڑا۔ اس بیوہ کی محنت اور مشقّت اور احتیاط کی وجہ سے ہی بچے پل سکے۔ وہی ان کے لئے روزی کماتی۔ دیر سویر کام کرتی۔ اُس کے حسنِ انتظام سے کھیتوں کی پیداوار اتنی ہو جاتی کہ خاندان بھر کا پیٹ بھر سکے۔

میری بڑی محنتی اور گرمجوش لڑکی تھی۔ اسے سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اس کی

طبیعت میں غیر معمولی تجسس تھا۔ جس کی وجہ سے اسے دنیا کے مسائل معلوم کرنے کی بڑی کھوج رہتی۔ ایک مرتبہ شیشہ ساعت یعنی وقت کے گزرنے کا پیمانہ دیکھنے میں وہ ایسی محو ہوگئی کہ اسے وہ کام یاد نہ رہا جو اس کی ماں نے اس کے ذمے کیا تھا۔ چند منٹ بعد وہ گرتی پڑتی دوڑتی ہوئی اپنی ماں کے پاس پہنچ کے کہنے لگی "میں نے وقت کو بنانے کا طریقہ دریافت کرلیا ہے۔ اس طرح کہ شیشہ ساعت کو الٹا رکھ دیا جائے"

اسکول میں تعلیم کے پہلے ہی دن سے اس نے بڑے غیر معمولی ذہن و حافظے کا ثبوت دیا۔ ذرا دیر کی محنت میں وہ فقرے کے فقرے یاد کرلیتی۔ چار دن میں اس نے اپنی گرامر کی کتاب رٹ لی۔ اور اپنی استانی کو شادی جو حیرت سے اس کا منہ تکتی رہ گئی۔

جب میری تیرہ سال کی ہوئی تو اس کی والدہ نے دوسری شادی کرلی۔ اور خود اداہایو منتقل ہوگئی۔ میری اپنے پرانے آبائی کھیتوں میں رہی۔ یہاں وہ اپنے اکلوتے بھائی کے لئے گھر چلاتی اور گاؤں کے ثانوی مدرسے میں خود اپنی تعلیم کی تکمیل کرتی رہی۔ بھائی اپنی اس چھوٹی سی گھر چلانے والی بہن کو ایک ڈالر فی ہفتہ اس کی محنت کا معاوضہ دیتا۔ اور وہ اس سے اسکول کے لئے کتابیں اور کپڑے خریدتی۔ اگر ہفتہ واری اجرت کافی نہ ہوتی تو سوت کات اور بُن کے کچھ اور پیسے کما لیتی۔ اور یہ کپڑا اپنے ہمسایوں کے ہاتھ بیچ دیتی۔

پانچ سال بعد جب اس کے بھائی نے شادی کرلی اور کھیتی باڑی چھوڑ کے نیویارک کا رخ کیا تو میری کو بھی اپنی روزی کی فکر کرنی پڑی۔ اس نے اسکول میں پڑھانا شروع کیا۔ یہاں اسے ہر ہفتہ چھہتر سینٹ ملتے۔ ان کے علاوہ رہنے اور کھانے کا مفت انتظام تھا۔ اس قلیل تنخواہ میں وہ آرام سے گزر نہ کرسکتی تھی۔ لیکن وہ ناخوش نہیں تھی۔ کیونکہ ریشمی اور کڑھے ہوئے کپڑوں سے زیادہ اسے اعلےٰ خیالات سے دلچسپی تھی۔ اس کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ اپنی تعلیم جاری رکھے۔ کئی سال کی محنت اور

پلیسہ پلیسہ بچانے کے بعد وہ اس قابل ہوئی کہ اپنے گاؤں کے قریب ہی ایک اکادمی میں اعلےٰ تعلیم حاصل کر سکے۔

میری کے لئے وہ وقت بڑا اہم تھا جب وہ پھر ایک بار اسباب باندھ کے اسکول جانے کے لئے تیار ہوئی تاکہ اپنی تعلیم کا سلسلہ پھر سے شروع کرے۔ اس نے اس موقع سے خوب فائدہ اٹھایا۔ نوشت وخواند میں اس کی صلاحیت دیکھکر اسکول کے نگرانِ کار بہت خوش ہوئے۔ سال ختم ہوا تو اس کے پیسے بھی ختم ہو چکے تھے۔ اور اسے اندیشہ تھا کہ اس کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔ لیکن اسے وظیفہ مل گیا جس کی وجہ سے اس کے اخراجات پورے ہونے لگے۔ لیکن اب بھی اس کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ کھانے اور رہنے کے اخراجات پورے ہوتے وہ سمجھتی تھی۔ کہ اسے تعلیم کا سلسلہ چھوڑنا ہی پڑے گا۔ لیکن اس نے یہ تجویز کی کہ اس کے پاس جو تھوڑا بہت سامان ہے۔ یعنی ایک بستر اور دسترخوان وغیرہ وہ اسکول لے لے اور اس کے کھانے اور رہنے کا مفت انتظام کر دے۔ اسکول کے نگراں کار نے یہ بات مان لی۔

میری نے دن رات سخت محنت شروع کی۔ وہ چار گھنٹے سے زیادہ نہ سوتی۔ جس طرح ہو سکتا تھوڑا بہت کھانا نگل لیتی تاکہ جس قدر وقت بچ سکے پڑھائی کے لئے بچالے۔ اسکول میں کوئی اور طالبہ علم اس کی برابری نہ کر سکتی تھی۔ ایک دن اس کی استانی نے اسے لاطینی زبان کی گرائمر مطالعہ کے لئے دی۔ اس نے تین دن میں ساری کتاب یاد کرلی۔ اور اگرچہ کلاس میں اور کسی نے لاطینی گرامر کی شُد بُد بھی حاصل نہ کی تھی اسے پوری کتاب ازبر تھی۔

جب یہ مدتِ تعلیم ختم ہوئی تو اسے پڑھانے کی نوکری آسانی سے مل گئی۔ آس پاس کے اسکولوں میں وہ اپنی محنت کی وجہ سے مشہور ہو چکی تھی۔ اور ان اسکولوں

کے نگراں چاہتے تھے کہ اسے نوکر رکھ لیں تاکہ اس کو دیکھ دیکھ کر دوسری لڑکیاں بھی اسی ذوق و شوق سے علم حاصل کریں۔ میری نے پڑھانے کی نوکریاں کئی جگہ کیں۔ محنت سے کام بھی کیا، لیکن دراصل وہ خود ابھی اور زیادہ علم حاصل کرنا چاہتی تھی۔ جونہی اسکول میں کلاس کی میعاد مکمل ہوتی وہ اپنا سارا بچایا ہوا سرمایہ لے کے کسی کالج میں داخل ہو جاتی تاکہ اپنے علم میں اضافہ کرے۔ ریورنڈ ڈاکٹر ہچکاک سے جو بعد میں ایمہرسٹ کالج کے پریسیڈنٹ مقرر ہوئے وہ تاریخِ حیاتیات پڑھتی اور ان کی بیوی سے ڈرائنگ اور مصوری سیکھتی۔ وہ یہ چاہتی تھی کہ اس کے ذہن کی طرح اس کا طرزِ تحریر بھی جلا پائے۔ اس لئے اس نے ایک استاد سے فنِ تحریر سیکھنا شروع کیا۔ ہر سبق وہ بڑی محنت اور کاوش سے یاد کرتی۔

کچھ عرصہ بعد میری لی اَن نے جو ہر وقت تعلیم حاصل کرنے کے موقعے تلاش کرتی ہی رہتی تھی، یہ سنا کہ بے فیلڈ میں عورتوں کا ایک بڑا غیر معمولی مدرسہ ہے۔ اس اسکول کے صدر مدرس ریورنڈ جوزف ایمرسن نہ صرف ایک مشہور استاد کی حیثیت سے اس علاقہ میں مشہور تھے بلکہ ان کی آزاد خیالی کی وجہ سے بھی ان کی کافی عزت ہوتی تھی۔ ان کی یہ رائے تھی کہ عام لوگوں کی رائے کچھ ہی سہی عورتوں میں بھی مابعد الطبیعات اور دینیات کی تعلیم پانے کی اتنی ہی صلاحیت ہے جتنی مردوں میں ہے۔ وہ اپنی کلاسوں میں تعلیم کا معیار اتنا ہی اونچا رکھتے جتنا مردوں کی کلاس میں رکھا جاتا۔ اور اپنی طالب علم لڑکیوں سے اس کی توقع کرتے کہ وہ اس معیار پر پوری اتریں۔ میری کو یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ ایک معلّم ایسا بھی ہے جس کے اصول اس کے اپنے خیالات کے عین مطابق ہیں۔ اس نے پیسے بچا کے اس اسکول میں داخل ہونے کا ارادہ کیا۔ جہاں عورتوں کو اپنے آپ کی عزت کرنا، اپنے آپ پر اعتماد کرنا، اور سوچنا سمجھنا سکھایا جاتا تھا۔

میری کی عمر چوبیس سال تھی جب وہ مالی حالت سے اس قابل ہوئی کہ بلے فیلڈ کے مدرسے میں تعلیم حاصل کر سکے۔ اس کی سہیلیاں جو اس کی اس مزید اور بظاہر غیر ضروری تعلیم حاصل کرنے کی مخالف تھیں اسے سمجھانے لگیں کہ اس نئے اسکول میں داخل ہونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ لیکن میری لی اَن مردوں اور عورتوں کے لئے یکساں تعلیمی مواقع ملنے کا خواب دیکھا کرتی تھی اور جب تک وہ اس اسکول میں داخل نہ ہو گئی، جو اس اصول کا مظہر تھا، اس نے دم نہ لیا۔ بے فیلڈ میں بہت کچھ سیکھنے کے مواقع تھے۔ وہ اس اسکول کی کلاسوں میں اتنی محو تھی کہ اسے بیرونی دنیا سے کوئی واسطہ نہ رہا۔ اس کی ایک سہیلی نے اپنی ایک اور سہیلی کو لکھا۔ "میری تم سب کو پیام محبت بھیجتی ہے لیکن اس کا وقت اتنا قیمتی ہے کہ وہ اسے خطوط لکھنے میں ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ وہ ٹوکروں علم حاصل کر رہی ہے۔"

اگلے سال ایک قریب کی اکادمی میں ایک مددگار مُدرِّسہ کی ضرورت تھی۔ اس جگہ کے لئے میری لی اَن کی سفارش کی گئی۔ عام طور پر ایسی آسامیوں پر مردوں کو ملازم رکھا جاتا تھا لیکن پرنسپل نے میری کی اعلےٰ اسنادِ قابلیت کی بنیاد پر اس کو انتخاب کیا اور اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہ عورت استانی اس کام کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے سکتی تھی۔

تھوڑے ہی دن بعد میری کو اس اکادمی سے زیادہ اچھی جگہ ڈربی، نیو ہیمپ شائر کے ایک بڑے اسکول میں مل گئی۔ یہ اسکول مس گرانٹ کی نگرانی میں تھا جو پہلے بے فیلڈ اکادمی میں پڑھاتی تھی۔ اور جو اپنی پرانی شاگرد میری لی اَن کی قدر پہچانتی تھی۔ اگرچہ یہ جگہ ترقی کی تھی لیکن میری اس کو قبول کرنے سے اس وقت تک ہچکچاتی رہی جب تک اسے یقین نہ ہو گیا کہ کیمیا اور تاریخ حیاتیات میں وہ اتنی قابلیت رکھتی ہے کہ پڑھا سکے۔ اس زمانے میں ان مضامین کی ضروری تعلیم صرف

ارورڈ، ییل اور ڈارٹ متھ کی یونیورسٹیوں میں دی جاتی تھی جو سرے سے لڑکیوں کو داخلہ ہی نہیں دیتے تھے۔ وظیفہ دینا تو ایک طرف رہا۔ اور بیچاری میری وظیفے کے بغیر اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکتی تھی، اس کی ہمت پست ہوگئی مگر اس نے ہار نہ مانی اور ایمہرسٹ کے پروفیسر اٹین سے درخواست کی کہ اپنی مصروفیت کے باوجود دن بھر میں چند گھنٹے اسے کیمیا پڑھا دیا کریں۔

اس علم کی جویا طالبۂ علم نے یہ کئی سال بڑے افلاس اور مصیبت میں گزارے۔ اکثر وہ پست ہمت ہو جاتی اور رو پڑتی۔ مگر پھر کام کے خیال سے صبر کر لیتی۔ اور محنت کرنے لگتی۔ اس نے ایمانداری سے اس کا اقرار کیا ہے کہ اس کی یہ رنجوری اس کی خودغرضی اور اپنے آپ پر ترس کھانے کی نشانی ہے اور اس نے اپنی شاگردوں کو نصیحت کی کہ وہ اس کی اس کمزوری سے سبق سیکھیں۔ اور اس میں اپنے آپ کو مبتلا نہ ہونے دیں۔ میری اکثر کہا کرتی "اگر تم ناخوش ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تم اپنے بارے میں بہت کچھ سوچتی ہو۔ اور دوسروں کی خوشیوں کے بارے میں کچھ نہیں سوچتیں"

بالآخر میری ڈیری میں پڑھانے لگی۔ اس کا سارا اندوختہ خرچ ہو چکا تھا۔ اور اب اس کے پاس صرف پہننے کے چند کپڑے رہ گئے تھے۔ لیکن وہ اپنی نوستے شاگردوں کو پڑھا کے خوش تھی۔ اس زمانے میں اس نے اپنی والدہ کو لکھا "یہی کیا کم نعمت ہے کہ مجھے کچھ کام کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ مجھے اس طرح کی مصروف زندگی گزارنے پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے"

ڈیری کا مدرسہ صرف گرمیوں میں کھلتا تھا۔ جاڑوں میں روزی کمانے کے لئے میری کو دوسرے اسکولوں میں نوکری کرنا پڑتی۔ وہ اپنے پیدائشی گاؤں بک فیلڈ واپس آ کے جوان عورتوں کو اعلےٰ تعلیم دیتی۔ اور ان سے صرف اتنا معاوضہ لیتی جتنا وہ آسانی سے دے سکتیں۔ اس کی شاگردوں کے رہنے اور کھانے کا قریب کے گھروں میں انتظام تھا۔ جہاں انہیں ایک ڈالر فی ہفتہ معاوضہ دینا پڑتا۔ جو بھی

جگہ ملتی اس میں میری کلاس کو پڑھاتی اور پچیس سینٹ فی ہفتہ فیس لیتی۔ پہلے سال میری کی شاگردوں کی تعداد صرف پچیس تھی اور اسے بس اتنا مل جاتا کہ تھوڑی بہت ضروریات پوری ہو جائیں۔ دوسرے سال شاگردوں کی تعداد بڑھ کر سو ہو گئی۔ اور یہ بورڈنگ اسکول اتنا مقبول ہوا کہ قصبے میں اس کے لئے ایک نیا مکان تعمیر کیا گیا تاکہ اس میں سہولت اور آسانی سے تعلیم دی جا سکے۔

لیکن میری اس لئے بے چین تھی کہ زیادہ سے زیادہ لڑکیاں کالج کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔ اور اس نے ان امکانات پر غور کیا۔ مس گرانٹ اب ڈیری کا اسکول چھوڑ کے اپس وچ کے اسکول میں صدر معلّمہ ہو گئی تھی۔ اور اس نے میری کو وہاں بلا بھیجا۔ یہ بڑا خوش حال مدرسہ تھا۔ بہت لڑکیاں اس میں پڑھتی تھیں۔ اور یہاں میری نے چھ سال تک بڑا کام انجام دیا۔ اس کی شاگرد لڑکیاں اس کی شخصیت سے مسحور ہو جاتیں۔ کیونکہ ان میں وہ علم کی محبت اور قدر بڑی خوش اسلوبی سے پیدا کرتی۔ لڑکیوں کو اس نے اوقات کی پابندی اور اَن تھک محنت سے علم حاصل کرنا سکھایا۔ وہ ان سے کہتی "نوجوان لڑکیو! تم یہاں بہت خرچ برداشت کر کے آئی ہو۔ تمہارے رہنے سہنے اور تعلیم کا خرچ بہت ہے۔ اور تمہارا وقت اس سے زیادہ قیمتی ہے۔ تم جتنا وقت اور پیسہ خرچ کر رہی ہو اس سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے تمہیں اصول کی پابندی سیکھنی چاہیئے"

وہ اس بات کا اچھی طرح اطمینان کر لیتی کہ جو لڑکیاں اپس وچ اسکول سے پڑھ لکھ کے نکلیں انہیں یہ یقین ہو جائے کہ ان کے علم کی قدر و منزلت ہو گی۔ وہ ان لڑکیوں کے دل میں یہ یقین جاگزیں کر دیتی کہ تعلیم نسواں مہذّب اور ترقی یافتہ سوسائٹی کے لئے نہ صرف مفید بلکہ ضروری ہے۔ وہ سخت استانی تھی لیکن لڑکیوں سے بڑی فیّاضی اور ہمدردی سے پیش آتی۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ کوئی استانی یا کوئی

اور نہ کسی لڑکی کی قابلیت کا مذاق اڑائے۔ وہ خود اپنے ہاتھ سے سی کر موٹے جھوٹے کپڑے پہنتی اور اس طرح جو روپے بچتے ان سے ایسی نادار لڑکیوں کی مدد کرتی جو اپنی تعلیم کے اخراجات خود برداشت نہ کر سکتیں۔ اسکول میں اور اسکول سے باہر سب لوگ میری بی اَن کو بہت پسند کرتے۔

جس زمانے میں میری بی اَن اپس وچ میں پڑھا رہی تھی، اس کا زندگی کا اصلی نصب العین یہ بیان کیا گیا کہ خود ایک زنانہ کالج کی بنیاد ڈالے۔ وہ اپنی سوسائٹی کی اس ناانصافی کو بھول نہ پاتی تھی کہ مردوں کے لئے تو کالج کی تعلیم کا بہترین انتظام تھا۔ وظیفے تھے، قرضے تھے۔ امداد کے دوسرے طریقے تھے لیکن ایسی سوسائٹی کی لڑکیوں کی تعلیم کی کسی کو فکر نہ تھی۔ اسی لئے اس نے ایک ایسا کالج کھولنے کا ارادہ کیا جہاں غریب سے غریب لڑکیاں بھی تعلیم حاصل کر سکیں۔

اس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی کہ اپس وچ اسکول ہی کو نئی عمارتوں اور عطیات کے ذریعے ایک مستقل ادارہ بنا دیا جائے۔ اس کی یہ امید اس لئے خاک میں مل گئی کہ کالج کی بنیاد کے لئے اس نے جلسہ طلب کیا تھا۔ اسی میں کافی لوگ نہیں آئے اور اس کام کی ابتدا نہ کی جا سکی۔

مس بی اَن نے پڑھانے کا سلسلہ جاری رکھا اور کچھ عرصہ کے لئے یہ خیال ترک کر دیا۔ لیکن اس کی امید اب بھی قائم تھی کہ کوئی نہ کوئی سلسلہ ایسا نکل آئے گا کہ اس کی تجویز عملی صورت اختیار کرے گی۔ ایک سال تک اپنی اس ناکامی پر کڑھنے کے بعد اس نے اِس اسکول سے استعفیٰ دینے اور اپنے زنانہ کالج کے لئے خود چندہ جمع کرنے کی تجویز سوچی۔ اس نے اپس وچ میں گھر گھر جا کے چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ "اس تحریک کے متعلق میں نے جس استقلال سے غور کیا، اور جس درد سے اسے محسوس کیا تا کہ حضرتِ عیسیٰؑ کا نام روشن ہو اور تعلیم کے ذریعے روحوں کو جلا حاصل ہو۔ اتنا غور و خوض

ہیں نے کسی اور بات پر نہیں کیا تھا"۔

چونکہ اس کی اس تجویز سے عورتوں ہی کو زیادہ فائدہ پہنچنے والا تھا۔ اس لئے اس نے سوچا کہ پہلے ہزار ڈالر کی رقم وہ عورتوں سے جمع کرے۔ جو عورتیں فوراً چندہ جمع نہ کر سکتیں۔ ان سے وعدہ لے لیا جاتا کہ آئندہ جب کبھی ان کے پاس پیسے ہوں چندہ ادا کریں۔ دو مہینے میں اس نے ہزار ڈالر جمع کر لئے اور اسے کئی ذی اثر آدمیوں کی امداد حاصل ہو گئی۔ اس نے اپنے پرانے استاد ڈاکٹر ہچکاک کی مدد سے کالج کا خاکہ بنایا۔ زمین کا ایک ٹکڑا نئے اسکول کے لئے جنوبی ہیڈلے میں انتخاب کیا گیا۔ رفتہ رفتہ عوام کو اس تحریک سے دلچسپی ہو گئی اور بہت سے لوگوں نے عمارت کی تکمیل کے لئے چندہ جمع کرنے میں مدد کی۔ مس لی اَن یہ دیکھ کر کہ اس کی تجویز کامیاب ہو رہی ہے ایک نئی امید کے ساتھ لوگوں سے اور زیادہ مدد مانگنے لگی، وہ عورتوں کی محفلوں میں تقریر کرتی اور ہر ایسے شخص سے ملتی جسے تعلیم نسواں سے دلچسپی تھی۔

بعض لوگ اس پر اعتراض بھی کرتے کہ وہ خواہ مخواہ اس رفاہِ عام کے کام میں پھنس گئی ہے۔ اور چندہ وصول کرنے کے لئے اجنبی لوگوں کے گھروں پر پھرتی ہے لیکن مس لی ان نے اس معاملے میں کسی کے کہنے سننے کی پروا نہ کی۔ وہ کہتی ہے۔ "میں جو کچھ کر رہی ہوں وہ بے جا کیسے ہو سکتا ہے۔ میں اپنے ایجنٹ مسٹر ہاکس کے پاس جاتی ہوں اور ایسے لوگوں سے ان کے گھروں پر ملتی ہوں اور ان سے اپنی تجویز کے متعلق باتیں کرتی ہوں جن سے امداد کی توقع ہے۔ اس میں کیا مضائقہ کی بات ہے، میرا دل شرافت کے ان جھوٹے اور کھوکھلے دعووں سے اکتا چکا ہے، میری روح رنجور ہے۔ میں ایک بہت بڑا کام کر رہی ہوں جس سے میں باز نہیں آسکتی"۔

بالآخر جتنی رقم کی ضرورت تھی جمع ہو گئی۔ اور ماؤنٹ ہول اوک کے کالج کی بنیاد

۳ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو رکھی گئی۔ میری لی ان لکھتی ہے "یہ بڑا دلچسپ تھا۔ پتھر اور اینٹیں اور چونا ایک ایسی زبان بول رہے تھے جو میرے دل میں گونج رہی تھی"۔ اگلے موسمِ خزاں میں اصل عمارت تیار ہوگئی اور کالج میں اوّلین طالبات کا انتظار ہونے لگا۔ میری چاہتی تھی کہ ہر طرح کی معاشی سطح کی لڑکیاں آکے تعلیم پائیں۔ اس لیئے رہنے، کھانے اور پڑھائی کا خرچ صرف ساٹھ ڈالر سالانہ رکھا گیا۔ اور مس لی ان نے خود اپنے لیئے قلیل ترین تنخواہ تجویز کی۔ ایک مکمل نصابِ تعلیم تیار کیا گیا اور اس کو پڑھانے کی تیاری کی گئی۔ پہلے سال صرف اسّی لڑکیوں کی سکونت کا انتظام تھا لیکن ایک سو ساٹھ لڑکیاں کالج میں داخل ہوئیں۔ اسکول کے نظم و ضبط کی ذمہ داری لڑکیوں ہی پر رکھی گئی۔ جن سے اسکول آتے ہی کہا جاتا کہ ان سے یہ توقع کی جاتی ہے، کہ بلا کسی کے حکم دیئے ہوئے وہ خود اصول کی پابندی کریں گی لڑکیوں کو سادہ اور کام کے کپڑے پہننے کے لئے کہا جاتا اور سمجھایا جاتا کہ رات کو دیر تک باہر رہنے یا زیادہ کھانا کھانے سے صحت خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

مس لی ان کو تمام شاگرد لڑکیاں بہت چاہتی تھیں۔ نظم و ضبط کی تعمیل کر کے وہ اس کی عزّت و توقیر کرتیں۔ اور اس کا خیال رکھتیں کہ اُن پر جو اعتماد اور اعتبار کیا گیا ہے وہ قائم رہے۔ یہ کالج بے حد کامیاب ہوا اور اگلے سالوں میں تو اس قدر کامیاب ہوا کہ مس لی ان نے اپنے خواب و خیال میں بھی اس کی توقع نہ کی تھی۔ جب میری کی پچاسویں سالگرہ ہوئی تو اس وقت تک دو ہزار لڑکیاں ماؤنٹ ہولی اوک کالج سے فارغ التحصیل ہو کر نکل گئی تھیں۔ اور کالج کا سارا قرضہ ادا ہو چکا تھا۔ ہر سال لڑکیاں جمع ہو کر اس عورت کو عزّت و توقیر کے تحفے پیش کرتیں جس نے ان کے لیئے اعلیٰ اور آزاد تعلیم کے مواقع بہم پہنچائے تھے۔ اب میری لی ان بڑی مشہور معلّمہ تھی لیکن وہ مسلسل محنت اور کوشش سے تھک گئی تھی۔ اس نے اپنی ساتھیوں سے کہا "مجھے ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ میری زندگی کی شام آگئی ہے اور مجھے آرام کی ضرورت ہے"۔

دو سال بعد جب کالج کی ایک لڑکی کا انتقال ہوا تو میری لی اُن نے سب لڑکیوں کو جمع کر کے تقریر کی کہ "نڈر ہو کر موت کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ اس کائنات میں کوئی چیز ایسی نہیں جس سے میں ڈر جاؤں۔ میں ہر چیز کے متعلق علم حاصل کرنا چاہتی ہوں اور یہی میرا فرض ہے جس کی میں تکمیل کر کے رہوں گی۔" کچھ عرصہ بعد یہی الفاظ اس کی قبر کے کتبے پر کندہ کیئے گئے۔ اس کے کارناموں کی یاد کے لئے کسی یادگار کی تعمیر کی ضرورت نہیں ہوئی۔ ماؤنٹ ہولی اوک کالج آج بھی میری لی اُن کے اعلےٰ خیالات و تصورات کی زندہ ترجمانی کرتا ہے ؎

فرانسس پرکنس

وزیر

سنہ ۱۸۸۲ء تا سنہ

فرانسس پرکنس پہلی خاتون ہے جو امریکہ میں وزیر بنی۔ کون ہے جو اسے نہیں پہچانتا۔ جب وہ سہ گوشہ ٹوپی پہنے وزارتِ عمال کے دفتر کو جاتی تھی۔ ہر جگہ وہ یہی ٹوپی پہن کے جاتی تھی اور یہ اس کی نشانی بن گئی تھی۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں جب اس نے اپنے اس عہدے سے استعفےٰ دیا تو یہ ٹوپی بھی اتاری اور دوسری ٹوپی پہن کے اس پارٹی میں گئی جو واشنگٹن میں اس کے وداع کے موقع پر دی گئی تھی۔

وہ ۱۰ اپریل سنہ ۱۸۸۲ء کو بوسٹن (ماسوچوسٹیس) میں پیدا ہوئی اور نیو انگلینڈ کے ایک قدامت پسند گھرانے میں پلی بڑھی۔ اس کے والدین ایسی لڑکیوں کو پسند نہیں کرتے تھے جو اپنی روزی آپ کمانا چاہتی تھیں۔ خاص طور پر ایسی عورتوں کو جو سیاسیات میں حصہ لینا چاہتی تھیں۔ ان کی لڑکی فرانسس اتنی شرمیلی تھی کہ اس میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ کسی کتب خانے میں جا کے کوئی کتاب مانگے۔ اس لئے جب اس نے اپنے ماں باپ سے یہ کہا کہ میں آپ لوگوں کی طرح ری پبلکن جماعت کے خیالات کی حامی نہیں، میں ڈیموکریٹ ہوں تو وہ حیران رہ گئے۔ اس نے اپنے حیرت زدہ والدین کو سمجھایا۔ کہ وہ اس مسئلے کو اچھی طرح سمجھ چکی ہے کہ ڈیموکریٹک پارٹی کا مقصد عوام کی بڑی تعداد کو فائدہ پہنچانا ہے۔ اور اس معاملے میں وہ ان کی ساتھی ہے۔ مطالعے کے درمیان میں وہ مزدوروں کے حالات پڑھ پڑھ کے بہت کڑھتی اور

اس کی ساری ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں۔

بچپن ہی سے اس میں خود سوچ بچار کرنے کی عادت تھی - وہ اپنے ماں باپ کے خیالات کو آنکھیں بند کر کے قبول نہ کرتی تھی خاندان کی مزاحمت کے باوجود اس نے طے کیا کہ وہ بڑی ہو کے سماجی کام کرے گی - دنیا میں کروڑوں آدمی نکبت و عُسرت میں مبتلا تھے - وہ خود آرام کی زندگی ہرگز نہ گذارے گی۔

۱۸۹۸ء میں فرانسس نے جنوبی ہیڈلے (ماسوچوسٹس) کے ماؤنٹ ہولی اوک کالج میں داخلہ لیا - اس زمانے میں اس کالج میں معاشیات یا عمرانیات کی تعلیم کا انتظام نہ تھا - اس سے ملتا جلتا جو کورس تھا وہ امریکہ کی معاشی اور عمرانی تاریخ کا تھا۔ یہاں پڑھ کے فرانسس اور مسرور ہوتی گئی اور اس کا یہ عزم راسخ ہوتا گیا کہ وہ اپنی زندگی معاشی خرابیوں کے انسداد کے لئے وقف کر دے گی - ماؤنٹ ہولی اوک کالج میں فرانسس کا شرمیلا پن کم ہو گیا - اور اس کی شخصیت کی واضح گرم جوش خصوصیات ظاہر ہونے لگیں - اس کی سہیلیوں کو پتہ چلا کہ اس میں بڑی انتظامی قابلیت ہے - اور وہ اپنی کلاس کی وائس پریسیڈنٹ منتخب ہوئی - کالج کے آخری سال میں وہ اپنی کلاس کی پریسیڈنٹ منتخب ہوئی۔

ماؤنٹ ہولی اوک کالج سے ڈگری لے کے جب وہ اپنے گھر دور سسٹر پہنچی تو اس کے گھر والوں نے کہا چلو اب تو یہ گھر آ گئی ہے - اب یہ کہیں شادی کر لے گی اور اس کے دماغ میں جو خیالی پلاؤ پکتے رہتے ہیں ان کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ لیکن ماں باپ کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ ان کی بیٹی کی طبیعت میں کتنا عزم و استقلال ہے۔ لیسٹر اسکول میں کچھ دن پڑھانے کے بعد فرانسس کی بے چینی بڑھتی گئی اور ماں باپ کی اجازت کے بغیر شکاگو چلی گئی - یہاں اس نے مشہور و معروف خدمتِ خلق کے مرکز ہل ہاؤس میں نوکری کر لی - جب وہ ماسوچوسٹس اپنے آبائی قصبے میں واپس آئی

تو اس کے والدین کو بڑا غصہ آیا کہ وہ دوسروں کے گھروں میں خادمہ کی نوکری کرنے گئی ہے۔ اس نے انہیں سمجھایا کہ وہ خادماؤں کی زندگی کے مسائل سمجھنے کے لئے یہ کر رہی تھی۔ اور جب تک وہ خود یہ تجربہ نہ کرے وہ ان کی مشکلات نہیں سمجھ سکتی۔ ان حالات اور مشکلات کا مطالعہ کر کے فرانسس کا یہ عقیدہ راسخ ہو گیا کہ مزدوروں اور خدمت گزاروں کے حقوق کے تحفّظ کے لئے سرکاری قوانین بننا ضروری ہے۔ لیکن اس میدان میں کوئی بنیادی کام کرنے سے پہلے اس نے محسوس کیا کہ اسے معاشیات اور عمرانیات کی مزید تعلیم حاصل کرنی پڑے گی۔ چنانچہ اس نے ان مضامین میں پن سلوے نیا یونیورسٹی میں ڈگری لی اور پھر کولمبیا یونیورسٹی میں داخل ہو گئی۔

کولمبیا سے اس نے سنہ ۱۹۱۰ء میں ایم۔ اے کیا۔ اس کے بعد فرانسس پرکنس کی عملی زندگی کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے اہم عہدہ جو اسے ملا وہ نیویارک سٹی میں صارفین کی انجمن کے انتظامی معتمد کی جگہ تھی۔ اس نئی خدمت پر عملی طور پر آ کے اسے ان حالات کے سدھارنے کا موقع ملا جنہیں اپنی سماجی خدمات کے دوران میں اس نے اچھی طرح دیکھا اور سمجھا تھا۔ اس نے کوشش شروع کی کہ مزدوروں، صارفین اور سماجی خدمات کے متعلق قوانین وضع کیے جائیں۔ اسے اتنی عزّت نصیب ہوئی کہ نیویارک کے گورنر ال اسمتھ نے اسے نیویارک اسٹیٹ کے انڈسٹریل بورڈ کی رکنیت پیش کی جب سنہ ۱۹۲۹ء میں ال اسمتھ کی جگہ فرینکلن روزویلٹ نیویارک کا گورنر مقرر ہوا تو فرانسس پرکنس کو اس کی پُرجوش خدمات کے صلے میں ریاست کا لیبر کمشنر مقرر کیا گیا۔

اس کام میں فرانسس پرکنس کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس نے مزدوروں اور سماجی خدمات کے متعلق کئی قوانین کے مسودے تیار کرنے میں مدد دی جو اب ریاست کے قوانین میں شامل ہو چکے ہیں اور امریکہ کی دوسری ریاستوں میں نئے قوانین کا نمونہ سمجھے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ جب سماج سدھار کا ایک قانون نیویارک اسٹیٹ

کی سینٹ کے روبرو آخری فیصلے کے لئے پیش تھا، اس نے دیکھا کہ منظوری کے لئے دو ممبروں کی کمی تھی۔ اس کے رفیق فرینکلن روزولٹ نے تقریر کو طوالت دی اس اثناء میں اس نے سینٹ کے دو ممبروں کو ٹیلیفون کیا جو نیو یارک جا رہے تھے کہ وہ آلبنی چلے آئیں وہ چلے آئے اور یہ قانون منظور ہو گیا۔

نیو یارک اسٹیٹ کی لیبر کمشنر کی حیثیت سے مزدوروں کے متعلق قوانین وضع کرنے میں فرانسس پرکنس نے بڑا نام پیدا کیا۔ اس شہرت کے باعث اور اس وجہ سے کہ وہ عرصے سے فرینکلن روزولٹ کے سیاسی کام میں اس کے ساتھ شریک رہی تھی، جب فرینکلن روزولٹ کو امریکہ کا پریسیڈنٹ منتخب کیا گیا تو مسٹر روزولٹ کی حکومت میں اس کا وزیر عمال بننا ایک قدرتی امر تھا۔ مس پرکنس کی یہ کوشش سیاسی عروج کے لئے نہیں، محض انسانی خدمت کے لئے تھی۔ ورنہ اسے بڑے عہدوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ فرینکلن روزولٹ کے پریسیڈنٹ منتخب ہونے کے تھوڑے ہی عرصے بعد اسے واشنگٹن بلایا گیا۔ وہ یہ سوچ کر گئی تھی کہ اگر پریسیڈنٹ نے اسے کوئی عہدہ پیش کیا تو وہ انکار کر دے گی۔ جب مسٹر روزولٹ نے اس سے یہ کہا تو اسے تعجب نہیں ہوا کہ "میں سوچ رہا ہوں کہ تم کو اپنی کابینہ میں وزیر عمال بناؤں"۔ اس نے فوراً جواب دیا "میں دراصل مزدور نہیں ہوں۔ اور مزدور یہ چاہتے ہیں کہ کوئی مزدور ہی ان کے حقوق کی نمائندگی کے لئے کابینہ میں وزیر بنے"۔ اس نے اپنی خامیاں گن گن کر بتائیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ عورت ہونے کی وجہ سے اس کی رائے کو اتنی اہمیت نہیں دی جائے گی۔ جتنی مردوں کی رائے کو دی جاتی ہے۔ پریسیڈنٹ نے جواب دیا کہ اس کے عورت ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کا فرض ہے کہ وہ حکومت میں مزدوروں کی نمائندگی کرے، خاص طور پر اس لئے کہ اس نے تہہ دل سے مزدوروں کی خدمت انجام دی ہے۔ یہ یقینی ہے کہ وہ

مزدوروں کے مسائل اور ان کی خواہشات کو پوری طرح سمجھ کر پیش کر سکے گی۔

یہ دیکھ کر کہ مسٹر روزولٹ اپنی رائے پر جمے ہوئے ہیں۔ فرانسس پرکنس نے بادل ناخواستہ کابینہ میں وزارت کا عہدہ قبول کر لیا۔ لیکن اس شرط پر کہ پریسیڈنٹ اس کے معاشی اصلاح کے پروگرام میں اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کریں۔ اس پروگرام کی خصوصیات یہ تھیں: بے کاری کے زمانے میں مزدوروں کی امداد، ایک ایسا قانون جس کی رُو سے مزدوروں کی کم از کم تنخواہ اور کام کے گھنٹوں کا تعین کیا جائے۔ بے کاری اور بڑھاپے کے زمانے کے لئے انشورنس۔ یہ سب تجاویز مسٹر روزولٹ کے نصب العین کے عین مطابق تھیں۔ انہوں نے پوری طرح مدد دینے کا تہہ دل سے وعدہ کر لیا۔

وزیر عمّال کی حیثیت سے اس کا پہلا دن بڑا ہمّت شکن تھا۔ یہ ظاہر تھا کہ یہ محکمہ اب تک بڑی لاپروائی سے چلتا رہا ہے۔ کمرے غلیظ تھے۔ افسروں کو اپنے فرائض کا علم نہ تھا۔ مس پرکنس کا بیان ہے کہ جب مجھے افسروں سے متعارف کرایا گیا تو چھ آدمیوں نے مجھ سے کہا کہ رسل و رسائل اور آبادکاری کا شعبہ میرے سپرد ہے مزید استفسار سے اسے پتہ چلا کہ بہت سی فائلیں یا تو غائب ہیں یا نامکمل ہیں۔ دفاتر میں بے ترتیبی ہے اور ملازمین میں ساتھ مِل جُل کر کام کرنے کی صلاحیت مفقود ہے۔

اس نے پہلا کام یہ کیا کہ دفتر کو صاف کرایا۔ افسروں کے فرائض اور ذمہ داریاں متعین کیں اور ایک لائحہ عمل بنایا۔ چونکہ اسے اس قسم کے کام کا تجربہ نہ تھا اسلئے وہ کھلے دل سے ہر ایک کا مشورہ سنتی اور اس کے بعد رائے قائم کر کے فیصلہ کرتی۔

اسی سال اس پروگرام پر عمل شروع ہو گیا جس کا خاکہ وزیر پرکنس نے وزارت قبول کرنے سے پہلے پریسیڈنٹ کے سامنے پیش کیا تھا۔ وہ ہمیشہ سے اس کی حامی

تھی کہ مرکزی اور مقامی حکومتیں بے کاری کا مقابلہ کرنے کے لئے براہِ راست مالی امداد دیں۔ اس مقصد کے لئے اس نے پریسیڈنٹ اور اس کے مشیروں کے ساتھ ایک تجویز بنائی جس نے بعد میں پبلک ورکس ایڈمنسٹریشن کی شکل اختیار کی۔ اس قانون کا مقصد نہ صرف بیکاری کی صعوبتوں کو کم کرنا تھا۔ بلکہ صنعت کی بیماریوں کا مداوا کرنا بھی تھا۔ اسی زمانے میں وزیرِ عمّال نے اور تجویزیں بھی مرتب کیں تاکہ ریاستہائے متحدہ کے فیڈرل قانون میں ایسی ترمیمیں کی جائیں جن کی رُو سے مزدوروں کے لئے تنخواہ کی کم از کم حد اور کام کے زیادہ سے زیادہ گھنٹوں کی حد بندی کر دی جائے۔ یہ تجویزیں آگے چل کے نیشنل ریکوری ایکٹ میں شامل کر دی گئیں۔ جیسی کہ مس پرکنس کو توقع تھی۔ ان قوانین سے مزدوروں کی حالت بہت سدھر گئی اور بے کاروں کو اس سے کافی مدد ملی۔

اسی اثناء میں مس پرکنس نے پریسیڈنٹ کو اس پر آمادہ کر لیا تھا کہ ایک ایسا مسوّدۂ قانون تیّار کیا جائے جس کی رو سے لاکھوں بے کار افراد کو روزگار مل سکے۔ اس کا نتیجہ ورکس پروجیکٹس ایڈمنسٹریشن اور سیویلین کنسرویشن کور کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ان دونوں تنظیموں پر اگرچہ سخت نکتہ چینی کی گئی لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ان سے قوم کے معاشی سدھار میں بڑی مدد ملی۔

وزیر پرکنس نے عوام الناس کے لئے تلاشِ روزگار میں ایک سرکاری محکمہ کانگریس کی منظوری سے قائم کیا۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں یہی ایجنسی سپاہیوں کی تلاش کا بین مرکز بن گئی۔ اور جنگ کے لئے اسلحہ اور صنعتوں کی تیاری میں اس سے بڑی مدد ملی۔

لیکن مس پرکنس کا سب سے قابلِ فخر کارنامہ —— جس کو وہ خود اپنے وزارتِ عمّال کے دور کا سب سے تعمیری کام قرار دیتی ہے —— سماجی تحفّظ کا قانون ہے۔

جس کی رُو سے اس نے بڑھاپے کی پنشن کا انتظام کیا۔ یہ قانون اس زمانے کی امیدوں اور نصب العین کا نتیجہ تھا جب وہ چیکاگو کے ہل ہاؤس میں کام کیا کرتی تھی۔

سماجی تحفّظ کے قانون پر ۱۹۳۴ء میں کام شروع ہُوا۔ وزیر پرکنس نے خود جا کے پریذیڈنٹ سے اس تجویز کو مرتب کرنے کی اجازت چاہی۔ پریذیڈنٹ روزویلٹ نے اسے فوراً معاشی تحفّظ کی کمیٹی کا صدر بنا دیا جس کا کام یہ تھا کہ اس تجویز پر غور کرے اور اپنے فیصلے کو کانگریس کی کمیٹی کے روبرو پیش کرے۔ ایک سال کی مسلسل محنت کے بعد یہ مسوّدہ قانون جس کی رُو سے حکومت پر بے کاری اور بڑھاپے کی پنشن کی ذمہ داری عائد کی گئی تھی منظور کر لیا۔ اور پریسیڈنٹ اور وزیر عمّال دونوں کے لئے یہ بڑی مسرّت کا موقع تھا۔ لیکن سماجی تحفّظ کے قانون کے رائج ہو جانے کے بعد بھی مس پرکنس کو اس عظیم الشان سماجی اصلاح کی جتنی داد ملنی چاہیئے تھی نہیں ملی۔

وزیر عمّال کا کام محض یہی نہیں تھا کہ مزدوروں کی فلاح کے لئے قوانین کا مسوّدہ بناتی اور انہیں منظور کراتی رہے۔ وزارتِ عمّال کے بعض شعبے پوری طرح محنت نہیں کرتے تھے۔ مس پرکنس نے فوراً یہ تحریک شروع کی کہ ان کے کام میں نئی سرگرمی اور قوّت پیدا ہو۔ مثلاً اس نے دیکھا کہ مزدوروں کے متعلق اعداد و شمار کے دفتر میں جو اعداد و شمار تھے وہ سب غلط اور فرسودہ تھے۔ اور حکومت اور عوام کی دسترس سے باہر تھے۔ اس نے فوراً اس شعبے کی از سرِ نو تنظیم کی۔ نیا مواد اکٹھا کیا۔ اور اس کی عام اشاعت کی۔ رفتہ رفتہ یہی شعبہ اس قسم کی قابل وثوق اطلاعات کا سب سے بڑا ذخیرہ بن گیا۔ اور قوم کی نظروں میں اس کی وقعت، افادیت اور اہمیّت بڑھ گئی۔

مس پرکنس بارہ سال تک کابینہ میں وزیر رہی۔ لیکن لوگوں کو اس کے متعلق غلط فہمی رہی۔ اس کے خاندان میں یہ رواج تھا کہ گھریلو زندگی کے معاملات کو بالکل راز

میں رکھا جائے۔ وہ بہت کم کہیں باہر جاتی۔ ایک مرتبہ اس نے اپنی ایک پھوپھی کی ایک نصیحت کا ذکر کیا جس نے اس موقع پر جب اس نے پہلی بار سرکاری خدمت قبول کی یہ کہا تھا "یہ یاد رکھنا فرانسس کہ ہمارا پرکنس خاندان گھریلو زندگی گزارتا ہے۔ اور ہمارے رہنے سہنے کا طریقہ بڑا گھریلو ہے۔" وہ اپنے سیاسی کارناموں کی وجہ سے بہت مشہور ہوئی۔ لیکن اس نے اپنے خاندان کی یہ روایت فراموش نہ کی۔ اور اسی لئے لوگوں کو اس کے گھر کے متعلق بہت کم علم تھا۔ ۱۹۱۳ء میں اس کی شادی پال سے ہوئی۔ اس کی ایک لڑکی سوزانا ہے۔ مگر ان کے متعلق لوگ بہت کم جانتے ہیں۔

سرکاری کاروبار میں اس کے سابقہ شرمیلے پن نے ایک طرح کے تکلف کی شکل اختیار کر لی۔ لوگوں کو اس سے واقف ہونے میں دیر لگتی — ویسے اس کے اچھی طرح جاننے والے لوگ اس کی خوش خلقی کے معترف ہیں۔ اور اس کے خلوص اس کی خوش بیانی۔ اور خوش مذاقی کی تعریف کرتے ہیں۔ پریسیڈنٹ روزولٹ بھی اس کے اس پہلو سے واقف ہو گئے کیونکہ وہ اس کے ذاتی دوست بھی تھے۔ اور اس کی انتظامی صلاحیت پر بڑا اعتماد کرتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ وہ مسٹر روزولٹ سے بڑی دلیری سے گفتگو کرتی تھی۔ اس نے بلاخوف پریسیڈنٹ سے کہہ دیا تھا کہ تیسری بار ان کا پریسیڈنٹ منتخب ہونا خطرناک اور غیر ضروری ہے۔ لیکن جب مسٹر روزولٹ نے چوتھی بار پریسیڈنٹ بننا چاہا تو وہ خاموش ہو گئی۔

اگرچہ وہ ہمیشہ پریسیڈنٹ سے درخواست کرتی رہتی کہ وزیر عمّال کی خدمت سے اس کا استعفٰے منظور کر لیا جائے۔ لیکن صدر مملکت اس خاتون کی مدد سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ جس کے مشورے سے اس نے اپنی مشہور و معروف نئی معاشی تقسیم کا منصوبہ بنایا تھا۔ جب وہ سبکدوش ہونا چاہتی تو اس کی درخواست یا رد کر دی جاتی

یا اسے کوئی جواب نہ ملتا۔ بارہ سال تک فرانسس پرکنس فرنکلن روزولٹ کی رفیق اور ساتھی کی حیثیت سے کام کرتی رہی۔ روزولٹ کے مرنے کے بعد اس نے کابینہ میں اپنا عہدہ چھوڑا اور خاموشی اور تنہائی کی وہ زندگی اسے نصیب ہوئی جس کی وہ ہمیشہ سے خواہاں تھی۔

بحیثیت انسان کے فرانسس پرکنس میں بلا کا انکسار ہے وہ کبھی بھی عظمت حاصل نہیں کرنا چاہتی تھی، نہ یہ چاہتی۔ کہ اس کی لیاقت کا ڈھنڈورا پیٹا جائے۔ وہ صرف صاف ستھری زندگی بسر کرنا چاہتی ہے اور یہ چاہتی تھی کہ چند اعلےٰ مقاصد جن کے لئے اس نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی پورے ہوں۔ بڑی حد تک اس کی آرزو پوری ہوئی اور سرکاری عہدہ داری کے زمانے میں اس نے جو خدمات انجام دیں۔ ان پر اگر وہ فخر کرے تو بے جا نہ ہوگا۔

غالباً سب سے زیادہ تکلیف اسے اخباروں کے ہاتھوں برداشت کرنی پڑی وہ تشہیر سے بے حد خوف کھاتی تھی۔ اور حتی الامکان پریس کانفرنسوں اور اخباری نمائندوں سے دامن بچاتی۔ ان بیچاروں کی روزی کا دارومدار ہی خبروں کے جمع کرنے پر ہے جب اسے اس کا احساس ہوا کہ یہ لوگ جو اسے طرح طرح کے سوال کر کے دق کرتے ہیں۔ اور اس کے کام میں حارج ہوتے ہیں۔ دراصل اپنا فرض انجام دے رہے ہیں۔ تب کہیں وہ مجبوراً پریس کانفرنسوں میں ...... جانے لگی۔

فرانسس پرکنس کی ایک بڑی خصوصیت اس کا تیز اور ہمہ گیر ذہن ہے — خوش قسمتی سے اس نے حافظہ بھی اچھا پایا۔ حافظے کے بغیر اسے اپنے کام میں مشکل پیش آتی۔ جس میں اعداد و شمار کا یاد رکھنا اور ان کا تجربہ کرنا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ایک سے زیادہ کانگریس کے ارکان نے اس کی تعریف کی کہ اس مشکل

موضوع کے متعلق اس کی معلومات بہت غیر معمولی ہیں۔ اور وہ بڑی صفائی اور آسانی سے اپنے خیالات کا اظہار کر سکتی ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں وزارتِ عمّال کے فرائض کو بڑی غیر معمولی قومی اہمیت حاصل ہو گئی کیونکہ جنگ کے جیتنے کا دارومدار ہی ہتھیاروں کی خوبی اور فراوانی، سامان کی فراہمی اور غذا کی تیاری پر تھا۔ مزدوروں اور سرمایہ داروں کے اختلافات رفع کرنے کے لئے مصالحت کے بورڈ بنائے گئے۔ جس پر کئی قابلِ تصفیہ امور کو بورڈ کے فیصلے کے لئے بھیج دیتی۔ مزید برآں وزارتِ عمّال نے بڑی محنت اور کاوش سے یہ معلومات ہمیشہ بہم رکھیں۔ کہ صنعت اور مزدوروں کے اعداد و شمار کے لحاظ سے جنگ کے لئے سامان کی تیاری کا اندازہ اطمینان بخش ہے یا نہیں۔ اور حکومت کی اہم ترین ضرورتیں کیا ہیں۔ جرمنی کے ساتھ صلح ہونے سے بہت پہلے جنگ کے بعد امن کے ایّام کے لئے ان صنعتوں کی تبدیلی کا کام شروع ہو گیا تھا۔ اور یہ بڑی تیزی سے مکمل ہوا۔

۱۹۴۵ء میں پریذیڈنٹ روزولٹ کی غیر متوقّع موت کے کچھ ہی دن بعد قوم کی واحد وزیر خاتون نے استعفےٰ دے دیا اور اس کی جگہ مسٹر شویلن باخ کا تقرر ہوا۔ اگرچہ وہ وزارت سے مستعفی ہو کے انتہائی گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے لگی لیکن اس نے قوم کی فلاح کے لئے جو کارہائے نمایاں کئے تھے۔ ان کی یاد لاکھوں امریکنوں کے دلوں میں تازہ اور روشن ہے۔ اس کی ایک کتاب "روزولٹ جنہیں میں جانتی تھی" بہت مشہور ہوئی۔ یہ اس عظیم المرتبت پریسیڈنٹ کی شخصیت کی سچی اور مقبولِ عام تصویر ہے یہ کتاب ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی:۔

ایلی نورؔ رُوزولٹ

اِنسان دوست

سنہ ۱۸۸۴ء تا سنہ ء

ایلی نور رُوزویلٹ امریکہ کے ایک پریزیڈنٹ کی بیوی ہے۔ لیکن بہ اس حثیت کی پہلی خاتون ہے جس نے امریکی قوم کی خدمتگار بیٹی کی حیثیت سے محض تھوڑے بہت تفریحی سماجی کام کو کافی نہیں جانا۔ وہ اپنی ذہنی استعداد اور اپنی سعی و عمل کی وجہ سے نہ صرف امریکہ میں بلکہ دنیا بھر میں ایک خاص شخصیت کی مالک ہے۔ اس عورت کے خیالات اور اس کا نصب العین دنیا بھر کے سیاسی اور سماجی کام میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ بڑی صاف گو ہے اور اس لئے لوگ اس پر تنقید بھی کڑی کرتے ہیں۔ اور اسے چاہتے بھی بہت ہیں۔ لیکن اس کے مخالفین بھی اس کی عظمت کے معترف ہیں۔ ایک اخبار نویس جو اس کا بڑا ہی سخت مخالف تھا لکھتا ہے "میرے خیال میں اگر ہم صاف صاف اسے امریکہ کی سب سے بڑی عورت تسلیم ہی کرلیں تو اچھا ہے کیونکہ شاید ہی کوئی اور عورت اس کے برابر محنت کرتی ہو یا لوگوں کے دل کے اندرونی دُکھ درد کو اتنا جانتی ہو جتنا وہ جانتی ہے۔"

ایلی نور روزولٹ خود مجموعہ اضداد ہے وہ ایک امیر اور باوقعت گھرانے میں پیدا ہوئی۔ لیکن عام غریب لوگوں کی طرفدار رہی۔ اس نے خود کبھی غُربت یا ظلم کی مصیبت نہیں برداشت کی۔ لیکن وہ غربت اور ظُلم کو خوب سمجھتی ہے۔ بچپن میں وہ بہت حساس تھی، ناخوش رہتی، اپنے آپ میں کھچی رہتی۔ ذرا ذرا پھوہڑ بھی تھی اور بہت سادگی

سے رہتی تھی۔ لیکن ترقی کر کے اس نے بڑی خود اعتمادی اور اپنی شخصیت میں بڑی دلکشی پیدا کر لی نوجوانی میں وہ اس قدر حساس تھی کہ اپنی عمر کے بچوں سے اس کی دوستی مشکل سے نبھ سکتی۔ لیکن آج اس میں انسانی ہمدردی کا ایک نمایاں احساس موجود ہے اس کی صاف گوئی اور خلوص کی وجہ سے غریب سے غریب آدمی اور متموّل سے متموّل شخص اس پر یکساں اعتبار کرتا ہے۔ اس کی شادی ایک ایسے شخص سے ہوئی جس میں بڑا جوش کردار تھا۔ لیکن اس نے اپنے شوہر کی عظیم الشان شخصیت کو اپنی شخصیت کے نشوونما پر حاوی نہ ہونے دیا۔ جب تک وہ نوعمر رہی اسے سکھایا جاتا رہا کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو۔ اسے یہ بھی سکھایا گیا تھا کہ عورتوں کو گھریلو زندگی گزارنی چاہیئے۔ اِدھر اُدھر نوکری نہ کرنی چاہیئے۔ لیکن آج وہ اس نوع کی عورتوں کی سب سے شاندار مثال ہے جنہوں نے گھر سے باہر کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

ایلی نور شہر نیویارک میں ۱۱ اکتوبر ۱۸۸۴ء کو پیدا ہوئی اس کی والدہ اینا ہال روزولٹ بہت حسین تھی۔ اور ۱۸۸۰ء میں نیویارک کی فیشن ایبل سوسائٹی کی ملکہ تصوّر کی جاتی تھی۔ اس کا باپ ایلیٹ روزولٹ بڑا پسندیدہ اور امیر آدمی تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اسے شراب کا بڑا چسکا تھا۔ ایلی نور کی گھریلو زندگی بچپن میں زیادہ اچھی نہیں گزری۔ چونکہ وہ خود سادہ صورت بلکہ ذرا بدشکل تھی اس لیئے اپنی ماں کے حُسن سے اپنا موازنہ کرکے وہ اپنے بے ڈھنگے پن کی وجہ سے کُڑھتی۔ لیکن وہ اپنے باپ کو بہت چاہتی تھی۔ باپ کے مقابلے میں اسے وہ احساسِ کمتری نہ تھا جس کی وجہ سے اس کی زندگی اجیرن تھی۔ لیکن وہ جلد ہی باپ کے سائے سے محروم ہوگئی کیونکہ ابھی وہ چھوٹی ہی سی تھی کہ اس کے باپ کو ایک پاگل خانے میں داخل ہونا پڑا۔

اپنی زندگی میں بہت "چھوٹی سی نیل" کو اس کا احساس ہوگیا کہ نیویارک کی

عظیم الشان پانچویں شاہراہ کے دروازوں سے باہر ایسے لوگ آباد ہیں جو غربت و عسرت کا شکار ہیں۔ اس کا باپ اسے اخبار بیچنے والے لڑکوں کے کلب لے جاتا جہاں وہ ان بچوں کو کھانا کھلاتی جو اس سے عمر میں کچھ ہی بڑے تھے۔ وہ ان کے پھٹے پرانے کپڑے دیکھتی، اپنے باپ سے سنتی کہ وہ شکستہ جھونپڑوں میں۔ یا مکانوں کے نوکر خانوں میں رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ جب وہ اپنی خادمہ کے ساتھ گاڑی میں چلی جا رہی تھی۔ اس نے ایک بوڑھے کو ایک بٹوا چراتے دیکھا۔ ہفتوں تک اس مصیبت کے مارے بوڑھے کا چہرہ اس کے تصور سے محو نہیں ہوا۔ بچپن ہی میں اسے احساس ہوا کہ اسے ان غربت کے ماروں کی کسی نہ کسی طرح امداد کرنی چاہیئے۔ جن کو کبھی اتنا پیسہ میسر نہیں ہوا کہ اپنی ضرورتیں رفع کر سکیں۔

جب ایلی نور آٹھ سال کی تھی اس کی ماں کا مرض خناق سے انتقال ہو گیا۔ اس کی دادی بچوں کو نیویارک کی ۳۷ ویں شاہراہ پر اپنے قدیم وضع کے فیشن ایبل مکان میں لے گئی اور ان کی تربیت "وکٹوریائی" قدامت پسندی اور سختی کے ساتھ شروع کی۔ اب ایلی نور حقیقی دنیا سے گریز کرنے کے لئے ایک ایسی دنیا کا خواب دیکھا کرتی جس میں وہ اپنے باپ کے ساتھ رہتی۔ لیکن ۱۸۹۴ء میں ایلیٹ روزولٹ نے وفات پائی۔ اور یہ خواب بھی ختم ہو گیا۔ اس بچی کو باپ کے مرنے کا یقین نہیں آیا۔ اور وہ کئی سال تک اسے زندہ سمجھتی رہی۔

دادی اماں بچوں کی جن اصولوں پر پرورش کر رہی تھی۔ ان کی وجہ سے ایلی نور اور زیادہ حساس بن گئی۔ نومبر سے اپریل تک اسے فلالین کے کپڑے پہننا پڑتے۔ اور اس کے ساتھ لانبے سیاہ موزے اور اونچے بیس کے جوتے پارٹیوں میں اور رقص کے درس میں دوسری فیشن ایبل لڑکیوں کے لباس کے مقابل اپنے لباس کو دیکھ کر وہ بری طرح شرماتی۔ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے مختلف محسوس کرتی۔

ان حالات میں ایک دلکش شخصیت کی نشوونما مشکل تھی۔ ان ایام میں اس کی سب سے زیادہ دوستی ایک دھوبن سے تھی۔ ایلی نور نے بعد میں اقبال کیا کہ ان تکلیف دہ برسوں میں اس شگفتہ عورت کے ساتھ جو وقت گزرا اس میں میں نے بہت لطف اٹھایا۔ اور بہت کچھ حاصل کیا۔ زیادہ تر بچوں کو جس بے فکری، اور دوسرے بچوں سے ہنسنے بولنے کے مواقع ملتے ہیں، وہ اسے نہیں ملے۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ اس کی اپنی شخصیت خاموش تھی۔ اور وہ غیر معمولی دلکشی جو اس کے کردار میں بعد میں پیدا ہوئی اس وقت تک اس کے کہیں آثار نہ تھے اور کچھ اس کے پسِ منظر کی وجہ سے، پانچ میل کے احاطے کے باہر کچھ لڑکیاں ایسی تھیں جن کے ساتھ وہ کھیل سکتی تھی۔

۱۸۹۹ء میں جب ایلی نور پندرہ سال کی ہوئی اس کی تعلیم کا صحیح معنوں میں آغاز ہوا۔ اس سے پہلے اس نے گھر ہی پر تعلیم پائی تھی۔ لیکن اب اس کی پھوپھی بیسی اسے انگلستان لے گئی۔ اور لندن کے قریب ایلنس وڈ کے اسکول میں اسے داخل کرا دیا۔ اب اسے تھوڑی بہت خوشی نصیب ہوئی۔ تاریخ سے اسے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ساتھی لڑکیوں سے اسے بے حد لگاؤ پیدا ہو گیا۔ کیونکہ بچپن میں وہ ہمجولیوں کو ترس گئی تھی۔ یہاں اس نے اپنے آپ پر اعتماد کرنا بھی سیکھا۔

جب ایلی نور نے اپنی دادی اماں سے کالج جانے کی خواہش ظاہر کی تو وہ حیرت اور غصہ سے مبہوت رہ گئی۔ اس زمانے میں اس کے خاندان کی لڑکیاں اسکول میں تعلیم پاتی تھیں۔ لیکن اگر کوئی لڑکی کالج جانے کا نام لیتی تو بے حیا سمجھی جاتی۔ خاندان بھر نے اتنی مخالفت کی کہ ایلی نور کو یہ ارادہ چھوڑنا پڑا۔ اور اپنی دادی اماں کی مرضی کے مطابق سال بھر اس میں گزر گیا کہ اس کا سوسائٹی میں تعارف کرایا جاتا رہا تاکہ کسی اچھی جگہ اس کی شادی ہو جائے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ زیادہ کامیاب

نہیں ہو گی ۔ اپنی ماں کے ورثے میں اسے حُسن نہیں ملا تھا اور پریوں کے خاندان میں وہ بدشکل گنی جاتی تھی ۔

بہرحال اسی زمانے میں اپنے ایک دُور کے رشتے کے بھائی فرینکلن ڈیلانو روزویلٹ سے اسے زیادہ ملنے جُلنے کا موقع ملا ۔ یہ شخص حسین، خوش باش اور ہر لحاظ سے پسندیدہ تھا ۔ شادی کے قابل لڑکیاں اور ان کی مائیں اسے پسند کرتی تھیں ۔ لیکن اسی زمانے میں ایلی نور نے لوگوں کی امداد کے لئے عملی کام کرنے کا بیڑا اٹھایا ۔ اس نے ایک مدرسے میں تدریس شروع کی ۔

اس شرمیلی لڑکی کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ۱۹۰۳ء کے موسمِ خزاں میں اسے شادی کا پیغام پیش کیا گیا پیغام پیش کرنے والا فرینکلن ڈی لانو روزویلٹ تھا، جسے اس کے ساتھ کی لڑکیاں اپنے گروہ کا سب سے پسندیدہ نوجوان سمجھتی تھیں ۔ یہ جوڑا لوگوں کو بڑا عجیب وغریب معلوم ہُوا ۔ ایلی نور کم شکل اور بے ڈھنگی تھی ۔ فرینکلن روزویلٹ خوبصورت، ہر دلعزیز اور اپنے آپ پر بڑا اعتماد رکھنے والا نوجوان تھا ۔ لیکن بنیادی طور پر ان دونوں کا مذاق یکساں تھا ۔ دونوں کی زندگی کے مقاصد ایک جیسے تھے ۔ ۱۷ مارچ ۱۹۰۵ء کو دونوں کی شادی ہو گئی ۔ ایلی نور کے سرپرست اس کے چچا تھیوڈور روزویلٹ تھے ۔ جو اس زمانے میں امریکہ کے پریزیڈنٹ تھے ۔

فرینکلن روزویلٹ اس زمانے میں کولمبیا یونیورسٹی میں قانون پڑھ رہا تھا اس لئے ہنی مون منانے یہ شہر کے باہر تھوڑی ہی دور جا سکے ۔ لیکن جب کالج کی تعلیم ختم ہوئی تو دونوں نے یورپ کا سفر کیا ۔ اور وہاں حقیقی چھٹی منائی ۔ دونوں پیرس کے پُراسرار گوشوں کا چکر کاٹتے ۔ وہاں عجیب عجیب دوکانوں میں پرانی کتابیں اور تصویریں خریدتے ۔ موٹر پر انہوں نے الپس پہاڑوں کا سفر کیا ۔ اور کچھ عرصہ کے لئے سینٹ موریٹز میں ٹھہرے ۔ جرمن دیہات سے انہیں بڑی دلچسپی معلوم ہوتی اور یہ ان دیہات کی پرانی گلیوں میں گھنٹوں

روز گھومتے رہتے ۔ ایلی نور جس نے بچپن کی پرانی سختیوں اور پابندیوں سے آزادی پائی تھی ۔ بڑی خوش تھی ۔

۳ مئی ۱۹۰۶ء کو ان کی پہلی لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام انہوں نے اینا ایلی نور رکھا فرینکلن روزوٹ کی والدہ نے نیو یارک میں مشرق کی ۶۵ ویں شاہراہ پر زمین خرید کے مکان بنوا لیا تھا ۔ یہ نوجوان جوڑا بھی مسز روزولٹ کے یہاں رہنے لگا ۔ اس زمانے میں بھی ایلی نور میں اس خاص پُرجوش شخصیت کے آثار نہ تھے ۔ جو اس میں بعد میں پیدا ہونے والی تھی ۔ اس کے برعکس وہ بہت کم کسی معاملے میں رائے قائم کرتی ۔ زیادہ تر فیصلے اپنے شوہر اور اپنی ساس کی مرضی پر چھوڑ دیتی ۔ سیتی پروتی یا کاڑھتی اور اس میں خوش رہتی ۔ معاشرتی کام سے اسے البتہ اب بھی بہت دلچسپی تھی اور وہ اکثر خیرات کے کاموں میں حصہ لیتی ۔ لیکن اب بھی وہ بچپن کی ایلی نور کی طرح اپنے آپ میں گم رہتی اس کا سارا وقت خاندان کی خدمت میں صرف ہوتا ۔ ۱۹۰۷ء میں ایک اور بچہ پیدا ہوا ۔ اس لڑکے کا نام جیمز رکھا گیا ۔ پھر اور بچے پیدا ہوئے ۔ ۱۹۰۹ء میں ایک اور لڑکا فرینکلن ڈی روزولٹ جونیئر جو بچپن ہی میں مر گیا ۔ اور ۱۹۱۰ء میں ایلیٹ ۔

اس کا شوہر اپنے کاروبار میں تیزی سے ترقی کر رہا تھا ۔ مگر ایلی نور کی نشوونما آہستہ آہستہ ہوئی ۔ سب سے پہلے اسے اپنے احساس کمتری اور اس احساس پر کہ وہ کسی کام کی نہیں غالب آنا پڑا ۔ ۱۹۱۱ء میں جب روزولٹ خاندان آلبنی منتقل ہوا اور فرینکلن روزولٹ نے نیو یارک اسٹیٹ کے سینیٹر کا عہدہ سنبھالا ۔ ایلی نور نے پہلی مرتبہ سیاسی امور میں عملی دلچسپی لینی شروع کی ۔ وہ اکثر مجلس قانون ساز کی گیلریوں میں جا بیٹھتی ۔ اور بہت دلچسپی سے سینیٹ کے مباحثے سنتی ۔ آئندہ سال جون میں مسز روزولٹ پہلی مرتبہ ایک سیاسی مجلس میں شریک ہوئی ۔

۱۹۱۳ء میں پریزیڈنٹ ولسن نے فرینکلن روزولٹ کو بحریہ کا اسسٹنٹ سیکرٹری

مقرر کیا۔ مسز روزولٹ اکثر اپنے شوہر کے سرکاری سفر کے دوران میں اس کے ساتھ جاتی ۔ سرکاری زندگی کے ساتھ جس قسم کی چہل پہل وابستہ ہے۔ اس میں وہ زیادہ حصہ لینے لگی۔ اس کی شخصیت کی دلکشی جو ابھی تک پوشیدہ تھی اب عیاں ہونے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ سیاسی امور کے متعلق بڑی معلومات حاصل کرنے لگی۔

۱۷ اگست ۱۹۱۴ء کو ایک اور لڑکا پیدا ہوا۔ اس کا نام بھی انہوں نے فرینکلن ڈی روزولٹ جونیئر رکھا۔ دو سال بعد ۱۹۱۶ء میں ان دونوں کا آخری لڑکا جان پیدا ہوا۔

اپریل ۱۹۱۷ء میں جذبات کی کشمکش کے عالم میں مسز روزولٹ نے پریزیڈنٹ ولسن کا جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ سنا۔ اس دن وہ حسبِ معمول گھر کا کام کاج کرتی رہی کیونکہ تحفظ کی جبلّت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے روزمرہ کے کام کاج میں لگے رہیں گو ہمارے چاروں طرف دنیا پر زلزلے ہی کیوں نہ طاری ہوں۔ یہ فطرت کی ستم ظریفی ہے کہ جنگِ عظیم ہی کی بدولت مسز روزویلٹ کو وہ خود اعتمادی نصیب ہوئی جس کے بغیر وہ دنیا میں اپنا اثر و رسوخ نہ قائم کر پاتی۔ بڑی محنت اور جانفشانی سے اس نے صلیبِ احمر کا کام شروع کیا۔ وہ نیوی کے اسپتالوں میں جاتی اور سپاہیوں کے کینٹینوں میں کام کاج کرتی۔ ا سے سینٹ الزبتھ کے پاگل خانہ میں وہاں کے حالات دیکھ کر دہشت ہونے لگی۔ فوراً اس نے اسپتال کے نگران کاروں کو ان حالات کی اطلاع دی اور حالات کی اصلاح ہونے لگی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی سرکاری محکمے کی اصلاح کی کوشش کی۔ جب وہ گھر سے باہر کے کاموں میں زیادہ حصّہ لینے لگی تو اسے خود اندازہ ہوا کہ اس میں بڑی انتظامی صلاحیت ہے۔ اور وہ اسے بڑی دانشمندی سے استعمال کرنے لگی۔

۱۹۲۰ء میں اس نے نیویارک اسٹیٹ میں خانون رائے دہندوں کی انجمن میں

شرکت کی درخواست فوراً منظور کر لی۔ اب اس میں بڑی خود اعتمادی پیدا ہوگئی تھی۔ گھر سے باہر کی زندگی بہت اہم ہونے لگی۔ اب وہ زمانہ گذر چکا تھا کہ وہ کئی کئی دن گھر میں بیٹھی اداس غمگین رہتی۔

اگلے سال جب مسٹر روزویلٹ پولیو میں مبتلا ہوئے تو اس کی دنیا میں زلزلہ آ گیا۔ لیکن اس نے بڑی ہمت سے اپنے شوہر کی خدمت کر کے اسے صحت مند کیا۔ اس کی تیمارداری میں وہ اپنے اور سارے نئے فرائض بھول گئی۔ اگرچہ فالج کی وجہ سے مسٹر روزویلٹ چل پھر نہ سکتے تھے۔ لیکن ان کی بیوی ان سے بیماروں کا سا برتاؤ نہ کرتی۔ وہ اپنے گھر پر سیاسی رہنماؤں کو مدعو کرتی تاکہ اس کے شوہر سرکاری معاملات میں وہی پہلے کی سی دلچسپی لیتے رہیں۔ بدترین ایام میں بھی اس کی ہمت افزائی کی وجہ سے امید کی کرن روشن رہی۔

اس کے بعد جو زمانہ آیا اس میں مسز روزویلٹ نے اپنے وقت کا بڑا حصّہ سیاسی کام کاج میں صرف کیا۔ جو نصب العین ہمیشہ سے اس کے پیشِ نظر تھا اب اس نے اس کی طرف عملی اقدام کیا۔ اس نے عورتوں کی ٹریڈ یونین لیگ میں شرکت کی ڈیموکریٹک اسٹیٹ کمیٹی کے شعبۂ خواتین کی مالی کمیٹی کی صدارت قبول کی۔ وہ نیویارک اسٹیٹ کا دورہ کرتی رہی وہ رائے دینے والی عورتوں کی تنظیم کرتی۔ اور انہیں بتاتی کہ تاریخ معاشیات اور سیاسی اصولوں پر کو پڑھو اور اپنے ساتھی انسانوں سے مل جل کر رہو۔ اُسے اس امر سے بڑی دلچسپی تھی کہ عورتیں دنیا کے سیاسی امور میں حصّہ لیں اور شہریوں کی حیثیت سے اپنے سارے حقوق حاصل کریں۔

۱۹۲۸ء میں فرینکلن روزویلٹ کو نیویارک اسٹیٹ کا گورنر مقرر کیا گیا۔ مسز روزویلٹ نے پھر البنی کا رخ کیا اور سرکاری گھر میں قیام کیا۔ لیکن اب اس کی اپنی سیاسی زندگی بن چکی تھی اور اس کی دلچسپیاں بڑھتی اور پھیلتی جاتی تھیں۔ سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ

وہ لڑکیوں کے ٹاڈ ہنٹر اسکول میں پڑھانے کا وقت بھی نکال لیتی۔

۱۹۳۲ء میں اس کے شوہر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر منتخب ہوئے۔ مسز روزولٹ میں اب قوم کی اوّلین خاتون کے فرائض انجام دینے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ پہلا کام تو یہ کیا کہ صدر کی قیام گاہ وہائٹ ہاؤس کے نوکروں کی زندگی میں اس نے سہولتیں بہم پہنچائیں۔ وہ صرف جمہوری نصب العین کا ذکر ہی نہیں کرتی تھی جہاں موقع ملتا اس کو عمل میں بھی لاتی۔

اپنے سیاسی کام اور درس تدریس کے علاوہ ایلی نور روزولیٹ اپنے خیالات کو کتابی شکل میں بھی پیش کرتی رہی۔ اس کی پہلی کتاب کا نام تھا "جب تم بڑے ہو کے ووٹ دینے کے قابل ہو جاؤ"۔ وہ مسائل عامّہ کے متعلق رسالوں میں مضامین لکھتی ۱۹۳۳ء میں ایک زنانہ رسالہ میں اس نے سوال و جواب کا ایک کالم سنبھالا۔ بہت جلد ایک اس کا اپنا ہفتہ وار ریڈیو پروگرام بن گیا۔ اسے جو کچھ معاوضہ ملتا وہ ایک ایسی کمیٹی کے حوالے کر دیتی جس کا کام صحت اور تعلیم میں عوام النّاس کو فائدہ پہنچانا تھا۔ ۱۹۳۵ء سے اس نے ایک ایسا کالم لکھنا شروع کیا جو سارے ملک کے اخباروں میں چھپتا۔ یہ کالم بہر حال لکھا جاتا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ اس کی گود میں اس کا نواسا یا پوتا بیٹھا ہوتا اور وہ یہ کالم لکھوائی جاتی۔ ایک مرتبہ پریزیڈنٹ سی سی کیمپ میں تقریر کرکے انتظار کر رہا تھا اور اس کی بیوی اپنی سیکرٹری کو یہ کالم موٹر میں بیٹھی بیٹھی لکھوا رہی تھی۔ اور موٹر دور کھڑی تھی۔

امریکی حکومت کو مسز روزولٹ سے جو سب سے بڑی مدد ملی وہ یہ تھی کہ وہ عوام النّاس کے مسائل اور مشکلات سے بڑی اچھی طرح واقف تھی۔ اور وہ صدر کو ان سے آگاہ کرتی رہتی تھی۔ وہ ہر طرح کے لوگوں سے ملتی جلتی۔ جھینگے پکڑنے والے ماہی گیر، کارخانوں کے مزدور، مزدوروں کی انجمنوں کے لیڈر۔ اور واشنگٹن کے بڑے بڑے

مدبر۔ اس کا خلوص، اس کا عزم، عوام الناس کی خوشیوں اور صعوبتوں میں سچی ہمدردی اس کی عظمت کا رازتھے۔ کبھی کبھی اس کا شوہر پریزیڈنٹ اس سے کہتا "کاش اس خاص معاملے میں اصلی واقعات مجھے معلوم ہوتے"۔ اس کی بیوی اکثر اس سے کہتی "میں پتا لگاؤں؟" وہ جواب دیتا "ضرور" اور اس طرح یہ دونوں مل جل کر امریکی باشندوں کے مسائل اور ضروریات کا اتنا صحیح اندازہ کرتے جیسا ان سے قبل امریکہ کے کسی صدر اور اس کی بیوی نے نہیں کیا تھا۔

مسز روزولٹ کی مصروفیات اس قدر گوناگون رہی ہیں کہ ان سب کا ذکر ناممکن ہے معاشی ادبار کے زمانے میں اس نے ان طالب علموں کو مدد پہنچائی جن کی تعلیم کا سلسلہ ٹوٹ جانے کا ڈر تھا۔ چنانچہ نیشنل یوتھ ایڈمنسٹریشن وجود میں آیا۔ جس کی وہ بانی تھی۔ اس نے ہمیشہ اقلیتوں کی حمایت کی۔ وہ حبشیوں کے حقِ مساوات کی بڑی حامی تھی۔ جب دخترانِ انقلابِ امریکہ نے اپنے صدر دفتر کانسٹی ٹیوشن ہال میں ایک حبشن مغنیہ میرین انڈرسن کا گانا سننے سے انکار کیا تو اس نے اس انجمن سے استعفیٰ دے دیا۔ وہ لیبر یونین کی بڑی حامی تھی۔ اس کی ساری سرگرمیوں میں اس کا نصب العین حقیقی جمہوریت رہا اور وہ جمہوریت کو قائم اور باقی رکھنے کی ہر طرح جدوجہد کرتی رہی۔

۱۹۴۵ء میں اپنے شوہر کی موت کے صدمے کے بعد مسز روزولٹ نے وہائٹ ہاؤس سے تعلق منقطع کرکے بھی قومی اور بین الاقوامی امن اور ہم آہنگی کے کام کا سلسلہ جاری رکھا۔ اقوامِ متحدہ کی انجمن میں سماجی خدمتِ خلق اور ثقافت کے تحفظ کی کمیٹیوں میں وہ شرکت کرتی رہی۔ جن کا مقصد یہ تھا کہ دنیا بھر میں صحت، پناہ گزینوں، انسانی حقوق اور عورتوں کے حقِ مساوات کے مسائل حل کرتے رہیں۔ وہ اپنے خیالات کا بڑی صاف گوئی سے اظہار کرتی رہی۔ اس میں دنیا کے امور سمجھنے کی بڑی حیرت انگیز سمجھ بوجھ ہے۔

شاید ایلی نور روزولٹ کے کردار کا بڑا راز یہ ہے کہ اس کا نصب العین بہت بلند ہے۔ وہ صرف نظریات کی دوربین نہیں لگاتی۔ وہ کام کرنا جانتی ہے۔ الفاظ سے زیادہ وہ عمل کی جویا ہے۔ اور حکومت کے سست رفتار سرخ فیتے کو وہ پسند نہیں کرتی۔ اگرچہ اس کی شخصیت میں بڑا جوش و خروش ہے۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ کوئی اسے بحیثیت ایک خاتون کے ناپسند کرے۔ اس کے خلوص، ہر طرح کے انسانوں سے اس کی دلچسپی کا رہا ہے خیر میں اس کی خود فراموشی۔ اس کا روحانی جمال، اس کی فطرت کی دلکشی یہ ایسے خصائص ہیں کہ دنیا بھر کے لوگ اس کی قدر و عزّت کرنے پر مجبور ہیں۔ اس نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں — "یہ میری کہانی ہے"۔ "یہ دکھیاری دنیا"۔ "جمہوریت اور مذہب" اور ان کے علاوہ اور بہت سی کتابیں۔ یہ سب کتابیں صاف گوئی اور خلوص سے لکھی گئی ہیں۔ اور ان سے ان کی مصنّفہ کے کردار کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا

پیغمبر خدا صلعم کی رفیقۂ حیات

آپ کا نام عائشہؓ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو حمیراء کے لقب سے مخاطب کرتے تھے اور کبھی کبھی بنت الصدیقؓ بھی کہتے تھے۔ آپ کی کنیت اُمِّ عبداللہ تھی۔ لیکن حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی والدہ آپ کی بہن اسماء بنت ابوبکرؓ تھیں اور عبداللہ ابن زبیرؓ آپ کو اولاد کی طرح عزیز تھے

حضرت عائشہؓ کے والد کا نام عبداللہؓ اور کنیت ابوبکرؓ تھی۔ آپ رسول اللہؐ کے رفیق خاص تھے اور اپنی صاف گوئی اور صداقت کی وجہ سے صدیق کہلاتے تھے آپ کی والدہ کا نام اُمِّ رومان تھا۔

حضرت عائشہؓ کی تاریخِ پیدائش غالباً ۶۱۴ء ہے۔ آپ نبوّت کے بعد پیدا ہوئیں۔ اور حضرت ابوبکرؓ کا گھر اوّلین مسلمان گھرانوں میں سے تھا۔ اس لیے حضرت عائشہؓ نے اپنے گھر میں کبھی کفر اور شرک کی آواز نہیں سنی۔

حضرت عائشہؓ کو بچپن میں گُڑیوں کا بہت شوق تھا۔ لیکن ساتھ ہی انہوں نے غضب کا ذہن اور حافظہ پایا تھا۔ جو بات سن لیتیں اسے یاد رکھتیں۔ ہجرت کے وقت ان کی عمر صرف آٹھ سال کی تھی۔ لیکن اس کم سنی کے باوجود قوّتِ حافظہ کا یہ حال تھا کہ ہجرت کے تمام واقعات اُنکو بخوبی یاد رہے۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے انتقال کے بعد رسول اللہ صلعم کے ایک عزیز صحابی حضرت عثمانؓ بن مظعون کی بیوی خولہ بنت حکیم نے حضرت عائشہؓ کے ساتھ سرورِ کائنات

کے نکاح کی سلسلہ جنبانی کی۔ اس سے پہلے حضرت عائشہؓ کی نسبت جبیر بن مطعم سے ہو چکی تھی۔ لیکن جبیر کا خاندان ابھی اسلام نہیں لایا تھا۔ مطعم کی بیوی نے کہا کہ اگر یہ لڑکی ہمارے گھر آگئی تو ہمارا بچہ بے دین ہو جائے گا۔ اس لئے یہ نسبت ٹوٹ گئی۔ اور حضرت عائشہؓ کی نسبت حضرت رسول اللہ صلعم سے قرار پائی۔

جب حضرت عائشہ کا نکاح ہوا ہے تو وہ بہت صغیر سن تھیں۔ یہ شادی نہایت سادگی سے ہوئی۔ زمانہ جاہلیت کی تمام بدعتیں اس میں ترک کر دی گئیں۔ صغر سنی کی وجہ سے حضرت عائشہؓ نکاح کے بعد تقریباً تین برس میکے میں رہیں۔ اس کے بعد رخصتی ہوئی۔

شادی کے فوراً بعد حضرت عائشہؓ نے لکھنا پڑھنا سیکھا۔ ظہور اسلام کے وقت قریش کے سارے قبیلے میں کل سترہ افراد پڑھے لکھے تھے جن میں ایک خاتون شفا بنت عبداللہ عدویہ بھی شامل تھیں۔ ازواج مطہرات میں سے حضرت حفصہؓ، حضرت اُم سلمہؓ اور حضرت عائشہؓ نے انہی سے لکھنا پڑھنا سیکھا۔ نوشت و خواند تو ظاہری تعلیم ہے۔ باطنی تعلیم انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور فیضِ رفاقت سے پائی۔ تزکیۂ نفس، علم دین، فقہ، اسرار شریعت، معرفتِ قرآن یہ سب وہ بڑی ذہانت سے حاصل کرتی رہیں۔ اور رسول اللہ صلعم کی بہت سی تعلیمات مسلمانوں تک حضرت عائشہؓ کے ذریعے سے پہنچی ہیں۔

اسی طرح تاریخ اور ادب کا ذوق انہوں نے اپنے برگزیدہ والد حضرت ابوبکر صدیقؓ سے حاصل کیا۔ علم طب کی معلومات ان عرب وفود سے حاصل کیں جو ملک کے دوسرے حصوں سے خدمتِ رسولؐ میں حاضر ہوتے تھے۔

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ نہایت سادگی اور فقر کی زندگی گزارتے تھے۔ ان کا گھر نہایت معمولی سا تھا۔ بنی نجار کے محلّے میں مسجد نبوی کے چاروں طرف

کئی چھوٹے چھوٹے حجرے تھے۔ ایک حجرہ جو مسجد کی مشرقی جانب واقع تھا۔ اسی میں حضرت عائشہؓ رہتی تھیں۔ یہ حجرہ نو دس فیٹ سے زیادہ چوڑا نہ تھا۔ کچی دیواروں پر کھجور کی پتّیوں اور ٹہنیوں کی چھت تھی۔ اس پر بارش سے بچنے کے لئے ایک کمبل پڑا رہتا۔ دروازے میں ایک پٹ کا کواڑ تھا۔ حجرہ سے متّصل ایک بالاخانہ تھا جس کو مشربہ کہتے تھے۔ یہاں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی قیام فرماتے تھے۔

"گھر کی کل کائنات ایک چارپائی، ایک چٹائی، ایک بستر، ایک تکیہ جس میں چھال بھری تھی۔ آٹا اور کھجور رکھنے کے ایک دو مٹکے، پانی کے ایک برتن اور پانی پینے کے ایک پیالے سے زیادہ نہ تھی۔ راتوں کو چراغ جلانا بھی صاحبِ مسکن کی استطاعت سے باہر تھا۔ کہتی ہیں کہ چالیس چالیس راتیں گزر جاتی تھیں اور گھر میں چراغ نہیں جلتا تھا۔"

گھر کے کاروبار کے لئے بہت زیادہ اہتمام و انتظام کی ضرورت نہ تھی۔ کھانا پکنے کی بہت کم نوبت آتی تھی۔ خود حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ کبھی تین دن متّصل ایسے نہیں گزرے کہ خاندانِ نبوی نے سیر ہو کر کھایا ہو۔ فرماتی تھیں گھر میں مہینہ مہینہ بھر آگ نہیں جلتی تھی۔ چھوہارے اور پانی پر گزارہ تھا۔ فتح خیبر کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہرات کے سالانہ مصارف کے لئے وظائف مقرر کر دیئے تھے۔ اسّی وسق (بار شتر) چھوہارا اور ۲۰ وسق جَو۔ لیکن ایثار و فیاضی کی بدولت سال بھر کے لئے یہ سامان کبھی کافی نہ ہوا۔" (سیرتِ عائشہؓ)

حضرتِ رسالت مآب صلعم فرمایا کرتے تھے کہ "الٰہی جو چیز میرے امکان میں ہے (یعنی بیویوں میں معاشرت اور لین دین کی برابری) میں اس میں عدل سے کام لیتا ہوں۔ لیکن جو میرے امکان سے باہر ہے (یعنی عائشہ رضؓ کی خاص وقعت) اس کو معاف کرنا"

حضرت عائشہ رضؓ کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ محبّت تھی۔ ان کی خدمت گزاری کو وہ اپنا سب سے بڑا فرض سمجھتیں۔ یہاں تک کہ مرض الموت میں آپ بار بار دریافت فرماتے تھے کہ آج کون سا دن ہے۔ یہ سمجھ کر کہ آپ حضرت عائشہ رضؓ کی باری کا انتظار فرمارہے ہیں آپ کو ان کے حجرے میں لے گئے۔ وہیں آپ نے اپنی بیماری اور اپنی زندگی کے آخری دن گزارے۔ اور وہیں حضرت عائشہ رضؓ کے زانو پر سر رکھے ہوئے وفات پائی۔

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت عائشہ رضؓ صدیقہ کی زندگی ازدواجی محبّت کا بہت نادر نمونہ تھی۔ آپ کا تعلق عائشہ رضؓ کے حجرے سے ایسا تھا کہ نہ صرف یہ حجلۂ عروسی، گھر اور آخری بیماری اور تیمارداری کا مرکز رہا بلکہ یہی حجرہ جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا مدفن بنا۔ حضرت عائشہ رضؓ آخر تک اس مزارِ اقدس کی مجاور رہیں اور شروع میں کئی سال تک مزار سرورِ کائنات کے پاس ہی سوتی رہیں۔

رسولِ مقبول صلعم کے انتقال کے وقت حضرت عائشہ رضؓ کی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔ اس کے بعد تقریباً چالیس سال اور زندہ رہیں۔ آپ کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی حضرت عبداللہ رضؓ بن زبیر متبنّٰی تھے۔ لیکن سورۂ احزاب کی رُو سے ساری امتِ محمدیہ آپ کی اولاد تھی:-

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ وَاَزْوَاجُہٗ اُمَّھَاتُھُمْ

سورۂ احزاب کی اس آیت اور امہات المؤمنین کے متعلق دوسری آیتوں کی توجیہ سید سلیمان ندوی نے ان الفاظ میں کی ہے:۔

"اصل یہ ہے کہ ازواج مطہرات جو ایک مدت تک حامل نبوت کی محرم اسرار رہیں۔ ان کی بقیہ زندگی صرف اس لئے تھی کہ مقدس شوہر کی تعلیمات اور اسباق عمل کو جب تک جیتی رہیں دہراتی رہیں۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ صرف اسی فرض کی بجا آوری میں صرف ہوا۔ وہ مسلمانوں کی مائیں تھیں۔ ان کا فرض صرف بیٹوں کی تعلیم و تربیت تھی چنانچہ ان کے فرائض خود خدا نے مقرر کر دیئے تھے۔"

حضرت عائشہؓ نے اپنی زندگی اسی فرض کی بجا آوری میں صرف کر دی۔ ان کے اپنے گھر میں قرآن پاک کی بہت سی آیتیں اُتری تھیں۔ انہوں نے بہت سی احادیث سب سے پہلے سنی تھیں۔ اور دوسری احادیث کا پس منظر وہی سب سے بہتر جانتی تھیں۔ ان میں اجتہاد کی بڑی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ اور سورۂ احزاب کی آیتوں ہی کو انہوں نے اپنا لائحہ عمل بنایا: "اے پیغمبر کی بیویو تم عام اور معمولی عورتوں میں نہیں ہو، اگر پرہیز گار بنو۔ دب کر نہ بولا کرو کہ بیمار دل والے (منافقین) حوصلہ کریں۔"

جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دو سال کے بعد ان کے پہلے خلیفہ اور جانشین اور حضرت عائشہؓ کے والد بزرگوار حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بھی وفات پائی۔ بیوگی کے دو ہی سال بعد حضرت عائشہؓ کو یتیمی کا داغ بھی اٹھانا پڑا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالےٰ عنہ اور ان کے بعد حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں اسلام کو جو فروغ ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔ یہ فروغ صرف بیرونی فتوحات کی حد تک نہ تھا۔ حجاز اور مدینہ میں بھی اتنا ہی نظم و ضبط تھا اور خلیفۂ ثانی کی ذات

اسلامی خلق، فقر اور دبدبہ کا نمایاں نمونہ تھی۔ حضرت عائشہؓ حضرت عمر فاروقؓ کی بڑی عزت کرتی تھیں۔ حضرتِ عائشہؓ کے حجرے میں جنابِ رسالت مآب صلعم کے ایک پہلو میں حضرت ابو بکر صدیقؓ دفن تھے۔ حضرت عمرؓ کی بڑی تمنا تھی کہ دوسرے پہلو میں انہیں جگہ ملے۔ حضرت عائشہؓ کی خود ہی تمنا تھی کہ اس جگہ وہ دفن ہوں لیکن حضرت عمرؓ کے لئے انہوں نے یہ ایثار گوارا کیا کہ تاجدارِ دو عالمؐ کے پہلو میں جو جگہ باقی تھی وہ حضرتِ عمرؓ فاروق کی قبر کے لئے دے دی۔ اس طرح حضرت عائشہؓ کا وہ خواب پورا ہوا جو انہوں نے کئی سال پہلے دیکھا تھا کہ ان کے حجرے میں تین چاند ٹوٹ کر گرے ہیں۔

خلیفہ ثالث حضرت عثمانؓ بن عفان کے زمانے میں مسلمانوں میں پہلی مرتبہ باہمی رقابت، خانہ جنگی اور پھر کھلم کھلا بغاوت شروع ہوئی۔ خلیفۂ ثالث کے خلاف بغاوت کی ایک بڑی وجہ بنی امیہ کا عروج تھا۔ جو بنی ہاشم، بانی اسلامؐ اور اسلام کے دشمن رہ چکے تھے۔ اب بھی ان میں سے بعض خصوصیت سے مروان بن الحکم کی منافقت مکمل تھی۔ باغیوں کے سرغنہ محمد ابن ابو بکر تھے۔ جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے انتقال کے بعد ان کی والدہ کی شادی حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ہوئی تھی۔ جن لوگوں کو حضرت عثمانؓ غنی سے شکایت تھی وہ آ کے حضرت عائشہؓ صدیقہ سے شکایت کیا کرتے تھے اور وہ ان کو سمجھایا کرتی تھیں۔ ان میں ان کے سوتیلے بھائی محمد بن ابو بکر پیش پیش تھے۔ حضرت عائشہؓ صدیقہ ان کو سمجھاتی تھیں۔ لیکن وہ باز نہیں آتے تھے جب حضرت عائشہؓ حج کے ارادے سے مکہ معظمہ روانہ ہونے لگیں تو انہوں نے اپنے بھائی محمد بن ابو بکر کو ساتھ لے جانا چاہا مگر وہ تیار نہ ہوئے۔ بالآخر حضرت عائشہؓ حج کے لئے روانہ ہو گئیں۔ اور ان کے پیچھے ہی حضرت عثمانؓ شہید کر دیئے گئے۔

بعض متعصب مؤرخین نے حضرت عائشہؓ پر یہ اتہام لگایا ہے کہ وہ بھی حضرت عثمانؓ کے خلاف بغاوت میں شریک تھیں۔ چنانچہ مالک اشتر نے ان سے یہ سوال کیا تو اس کا جو انہوں نے جواب دیا۔ اُسے امام بخاری نے ہُو بہُو نقل کیا ہے۔

"خدا کی قسم میں نے کبھی پسند نہ کیا کہ عثمانؓ کی کسی قسم کی بے عزتی ہو۔ اگر میں نے کبھی ایسا پسند کیا ہو تو ویسی ہی میری بھی ہو۔ خدا کی قسم میں نے کبھی پسند نہ کیا کہ وہ قتل ہوں، اگر کیا ہو تو میں بھی قتل کی جاؤں۔"

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت حضرت عائشہؓ مکہ ہی میں مقیم تھیں۔ حج سے فراغت کے بعد آپ مدینہ روانہ ہوئیں، لیکن راستے میں فتنہ و فساد اور قتل و غارت کی خبریں سن کر آپ مکہ واپس تشریف لے گئیں۔ آپ کے لوٹنے کی خبر سن کر ایک انبوہِ کثیر آپ کے گرد جمع ہو گیا۔ جس نے جلد ایک لشکر کی صورت اختیار کر لی۔ ان لوگوں نے حضرت عائشہؓ سے درخواست کی کہ بصرے جا کر قیام کیا جائے اور وہاں سے حضرت عثمانؓ کے قصاص کا مطالبہ کیا جائے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ اصلاحِ حال کی خاطر ان لوگوں کی معیت میں بصرے روانہ ہو گئیں۔ اس اثناء میں اہلِ مدینہ حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے اور انہی کی طرف سے بصرہ میں عثمان بن حنیف گورنر مقرر کئے جا چکے تھے۔ انہوں نے اس لشکر کو بصرے سے باہر ہی روک دیا اور دونوں گروہوں میں مٹھ بھیڑ ہو گئی۔ حضرت علیؓ کو جب ان حالات کا علم ہوا تو انہیں بھی مجبوراً فوج لے کر بصرے جانا پڑا۔ اس مرحلے پر فریقین کی جانب سے مصالحت کی کوشش کی گئی۔ لیکن دونوں طرف سے بعض فتنہ جُو عناصر بالخصوص عبداللہ ابن سبا نے ان کوششوں کو ناکام بنا دیا اور آخر کار حضرت عائشہؓ کے ساتھیوں اور حضرت علیؓ کے حامیوں کے مابین وہ افسوسناک جنگ پیش آئی جسے جمل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ حضرت عائشہؓ شریک ہونے کو تو اس میں شریک ہو گئیں۔ مگر انہیں عمر بھر اس شرکت کا افسوس رہا۔ چنانچہ ابن سعد کا بیان ہے

کہ جب وہ سورۂ احزاب کی وہ آیت پڑھا کرتیں جس میں حکم دیا گیا ہے کہ "اپنے گھروں میں ٹھہری رہو" تو روتے روتے آپ کا آنچل تر ہو جاتا تھا۔ آپ نے اپنے آخری لمحات میں بھی یہ وصیّت کی تھی کہ مجھے روضۂ نبوی میں دفن نہ کرنا۔ بلکہ دوسری ازواج کے ساتھ جنت البقیع میں دفن کرنا۔ کیونکہ آنحضورؐ کے بعد مجھ سے ایک غلطی سرزد ہو گئی ہے"۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل بیت کی زندگی اگرچہ ایک مسلسل مجاہدے اور عسرت کی زندگی تھی، تاہم حضرت عائشہؓ دیگر ازواج مطہرات اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باہمی معاشرت اور عائلی فضا انتہائی خوشگوار، سکون آفرین اور طمانیت بخش تھی، کبھی کبھار تبقاضائے فطرت اگر کسی طرح کی شکر رنجی پیدا بھی ہوتی تھی تو وہ ایسی خوبصورتی اور خوش اسلوبی سے رفع ہو جاتی تھی۔ کہ بعد میں اس کی یادگار بھی "تلخ" ہونے کی بجائے شیریں بن کے رہ جاتی تھی۔ اس حقیقت کے ثبوت میں متعدد واقعات حدیث و سیرت کی کتابوں میں مروی ہیں اور یہ سب صحبت و تربیت نبوی کا فیضان تھا۔

ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا: "جب تم مجھ سے خوش ہوتی ہو تب بھی مجھے پتہ چل جاتا ہے اور جب ناراض ہوتی ہو تب بھی مجھے اس کا علم ہو جاتا ہے"۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا: "آپ کو کیسے معلوم ہوتا ہے"؟ آپ نے فرمایا۔ "جب تم خوش ہوتی ہو تو بات کرتے ہوئے کہتی ہو۔ محمدؐ کے رب کی قسم! اور جب ناخوش ہوتی ہو تو کہتی ہو، ابراہیم کے رب کی قسم!" حضرت عائشہؓ نے جواب میں کہا

"ہاں! واللہ یا رسول اللہ! میں آپ کے نام کو ترک کرتی ہوں، مگر آپ کی ذات کو نہیں چھوڑتی"۔

حضرت خدیجہؓ کے بعد حضرت عائشہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب ترین رفیقہ حیات تھیں۔ اس محبت کے جلو میں حضرت عائشہؓ نے اپنی زندگی کے اندر جس اطاعت گزاری و فاشعاری اور جان نثاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ آپ کو ہر لمحہ

آنحضرتؐ کی جسمانی آسائش اور روحانی طمانیت کی فراہمی کی فکر دامنگیر رہتی تھی۔

حضرت عائشہؓ فرائض کی پابندی کے علاوہ کثرت سے نوافل عبادات کو سرانجام دیا کرتی تھیں۔ اور یہ کیفیت وصالِ نبویؐ کے بعد سے بہت بڑھ گئی تھی۔ ایک مرتبہ آپ سے دریافت کیا گیا کہ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی آپ اسی طرح زہد و عبادت میں منہمک رہا کرتی تھیں؟ آپ نے جواب دیا کہ میری خواہش تو ہمیشہ سے ایسی ہی رہی ہے۔ مگر اس عہدِ سعادت میں مجھے ذاتِ رسالت کی خدمت بجالانے سے فرصت کہاں میسر آسکتی تھی؟

ازواج مطہرات ’امہات المومنین یعنی مسلمانوں کی مائیں کہلاتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ نازک ذمہ داری ڈالی تھی۔ کہ وہ امت کے افراد کی اس طرح تعلیم و تربیت کریں۔ جس طرح اپنی اولاد کی تربیت کی جاتی ہے۔ حضرت عائشہؓ نے اس فریضہ کو بطریقِ احسن ادا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نہایت حکیمانہ اور مشفقانہ طبیعت عطا کی تھی پھر آپ کی اپنی اولاد بھی نہ تھی۔ اس لئے آپ نے بہت سے بچوں اور بچیوں کو اپنے دامن عاطفت اور آغوش تربیت ہی سے کہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی طرح پالا، باقاعدہ درس و تدریس کی صورت میں انہیں تعلیم دی اور ان کی شادیاں کر کے انہیں گھر بار والا بنا دیا۔ آپ کے تربیت یافتہ شاگردوں کی تعداد ۲۰۰ کے لگ بھگ ہے۔ غلاموں کو خرید کر آزاد کرنا بھی آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ آپ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد سڑسٹھ [67] ہے۔

عمر کا آخری زمانہ حضرت عائشہؓ صدیقہ نے بڑی خاموشی سے بسر کیا۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد خلافتِ راشدہ ختم ہوئی۔ اور امیر معاویہ سے سلطنت بنوامیہ کا آغاز ہوا۔ وہ اس زمانہ میں بھی کئی سال زندہ رہیں۔ امیر معاویہ بھی ان کی انتہائی عزت و حرمت کرتے تھے۔ لیکن حضرت عائشہ رضؓ کو بے لاگ نصیحت کرنے میں کبھی باک نہیں ہوا۔ چنانچہ صحیح بخاری میں یہ واقعہ درج ہے کہ امیر معاویہ نے انہیں ایک خط لکھا کہ مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔ حضرت عائشہ صدیقہ نے اس کا یہ جواب دیا:۔

"السلام علیکم۔ امابعد میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا ہے کہ جو شخص انسانوں کی نارضامندی کی پروا نہ کرکے خدا کی رضا جوئی کرے گا خدا انسانوں کی نارضامندی کے نتائج سے اس کو محفوظ رکھے گا۔ اور جو خدا کو نارضامند کرکے انسانوں کی رضامندی کا طلب گار ہو گا خدا اس کو انسانوں کے ہاتھ میں سونپ دے گا۔
والسلام علیک۔"

حضرت عائشہ رضؓ صدیقہ نے ۵۷ھ میں انتقال فرمایا۔ ان کے غم میں سارا مدینہ منورہ ماتم پوش تھا۔ اپنی وصیت کے باعث جنت البقیع میں دفن کی گئیں۔

حضرت عائشہ رضؓ صدیقہ ان تمام صفاتِ حسنہ کا نمونہ تھیں جو انہیں فیضانِ رسول سے حاصل ہوئے تھے، اور جو قوانین اسلام کے لئے ایک نمونہ ہیں۔ ان کی طبیعت میں حد درجہ قناعت پسندی تھی۔ اگر کوئی ان پر احسان کرتا تو وہ اس کا بدل ضرور کر دیتیں۔ غیبت اور بدگوئی سے سخت احتراز فرماتیں۔ ان کی طبیعت میں غضب خود داری تھی۔ لیکن کبھی انہوں نے خود ستائی نہیں کی۔ ان کی سب سے نمایاں صفت ان کی فیاضی تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد سے لے کر امیر معاویہ کے دور تک ان کا مشاہرہ بہت کثیر تھا۔ لیکن جو آتا وہ اسی وقت فقرا اور مساکین کی نذر کر دیتیں۔

ان کے بھانجے عبداللہؓ بن زبیرؓ بھی ان کی مالی خدمت کیا کرتے تھے۔ لیکن وہ بھی ان کی دریادلی اور فیاضی کی نذر ہو جاتی۔

انہیں حضرت رسولِ کریمؐ کے ساتھ گھنٹوں عبادت کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ساری عمر وہ نہایت خضوع و خشوع سے عبادت کرتیں۔ ہمیشہ روزے سے رہتیں۔ قریب قریب ہر سال پابندی سے حج کرتیں۔

ان کا سب سے بڑا کارنامہ علوم دینی اور مسائل قرآنی پر ان کا عبور ہے چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے۔ ہم صحابیوں کو کوئی ایسی مشکل بات کبھی پیش نہیں آئی جس کو ہم نے عائشہؓ سے پوچھا ہو اور ان کے پاس اس کے متعلق کچھ معلومات ہم کو نہ ملی ہوں۔ علوم فقہ اور حدیث کے بڑے بڑے اوّلین ماہر مثلاً عطاءؒ بن ابی رباح تابعی، امام زہریؒ، ابو سلمہؒ بن عبدالرحمان بن عوف سب یک زبان ہو کر حضرت عائشہؓ کو فقہ اور حدیث کا بہت بڑا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ حفظِ حدیث اور سنن نبوی کی اشاعت میں ان کا مرتبہ سب سے جاری تھا۔ رسولِ پاک کے ساتھ کی وجہ سے حضرت عائشہؓ کو ایک ایک آیت کے طرزِ قرات، موقع استدلال اور طریقہ استنباط پر عبور کامل حاصل ہو گیا تھا۔ وہ ہر مسئلہ کے جواب کے لئے قرآنِ پاک سے رجوع کرتیں اور حدیثوں اور سنن کو قرآن پاک کی روشنی میں بیان کرتیں۔

احادیث نبوی اِ حد تک۔ حضرت عائشہؓ کا شمار سات کثیر الروایۃ صحابہ میں ہوتا ہے۔ کُل دو ہزار دو سو دس حدیثیں حضرت عائشہ سے منسوب کی جاتی ہیں جن میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں دو سو چھیاسی حدیثیں ان کی روایت سے بیان کی گئی ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایات اور حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ کی روایات کے درمیان جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے بزرگوں کی روایتیں محض روایتیں ہیں۔ لیکن حضرت عائشہؓ کی روایتوں میں اجتہادِ فقہی اور قوتِ استنباط موجود ہے وہ

جن احکام اور واقعات کو بیان کرتی ہیں۔ ان کے حالات و اسباب کا بھی ذکر کرتی ہیں اور ان کا صحیح پس منظر بھی بیان کرتی ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے آپ کی اس خصوصیت کا بڑی خوبی سے تجزیہ کیا ہے لکھتے ہیں: "فنِ حدیث میں حضرت عائشہؓ کا سب سے پہلا اصول یہ معلوم ہوتا تھا کہ روایت کلامِ الٰہی کے مخالف نہ ہو" حضرت عائشہؓ کے علاوہ ابتدائی راویوں میں صرف حضرت ابن عباسؓ کی روایتوں میں اجتہادِ فقہ کا نشان ملتا ہے۔

قصہ مختصر خواتینِ اسلام میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ذاتِ باصفات کو جو منصب اور جو حیثیت حاصل ہے اور ان کی مثال سے مسلمان عورتوں کو جو فیضان پہنچ سکتا ہے اس کا خلاصہ بھی مولانا سید سلیمان ندوی ہی کی زبانی سنیئے:

"جنس نسوانی پر ان کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے دنیا کو یہ بتا دیا کہ ایک مسلمان عورت پردہ میں رہ کر بھی علمی، ادبی، مذہبی، اجتماعی اور سیاسی اور پند و موعظت اور اصلاح و ارشاد اور امت کی بھلائی کے کام بجا لا سکتی ہے۔ غرض اسلام نے عورتوں کو جو رتبہ بخشا ہے اور ان کی گزشتہ گری ہوئی حالت کو جتنا اونچا کیا ہے اُمّ المومنین کی زندگی کی تاریخ اس کی عملی تفسیر ہے۔ صحابہ میں اگر ایسے لوگ گزرے ہیں جو مسیح اسلام کے خطاب کے مستحق اور عہدِ محمدیؐ کے ہارون بننے کے سزاوار تھے تو الحمدللہ صحابیات میں بھی ایک ایسی ذات تھی جو مریمِ اسلام کی حیثیت رکھتی تھی۔"

حضرت رابعہؒ بصریہ

صوفیۂ ولیہ

دو لحاظ سے حضرت رابعہؒ بصریہ کی شخصیت تاریخ مشاہیر اسلام میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ایک تو یہ کہ اگرچہ عورتوں میں سے کئی کو بزرگی کا درجہ حاصل ہوا لیکن کسی نے ولایت کا وہ بلند و برتر مقام حاصل نہیں کیا جو آپ کو حاصل ہوا۔ دوسرے یہ کہ علم دین اور باطنی تعلیم میں شاید ہی کسی اور خاتون نے اتنی فضیلت حاصل کی ہو کہ بڑے بڑے علماء، اولیاؒ اور زہاد آپ کے مقام اور مرتبے کے معترف تھے۔

حضرت رابعہؒ بصریہ کے حالاتِ زندگی بہت کم ملتے ہیں۔ اور ان کے معجزوں اور کرامات کا ذکر مقابلتاً زیادہ ملتا ہے۔ اس وجہ سے عہدِ جدید کی سوانح نگاری کے معیار کے مطابق آپ کی زندگی کے حالات کو تفصیل سے بیان کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ ہر ہر قدم پر ان کی زندگی کے اطراف معجزوں اور کرامتوں کی روایات کا ہجوم ہے یہاں تک کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مرتبین نے بھی آپ کی زندگی کا جو مختصر خاکہ کھینچا ہے۔ وہ کرامتوں اور غیر معمولی اشارات سے لبریز ہے۔

حضرت رابعہؒ بصریہ بصرہ کے ایک بڑے ہی غریب گھرانے میں پیدا ہوئیں اکثر یہ ہوا ہے کہ ایسے ہی گھرانوں میں ارشاد و ہدایت کا چراغ جلتا ہے۔ لیکن ان کے گھر کی غریبی کا یہ عالم تھا کہ چراغ جلانے کے لیے تیل تک نہ تھا۔ جس رات آپ پیدا ہوئیں نہ چراغوں کے لیے تیل تھا نہ گھر میں اتنا فالتو کپڑا تھا کہ اس میں آپ کو لپیٹا جا سکے۔ آپ کے والدین کثیر العیال تھے۔ تین بہنیں پہلے سے تھیں۔ آپ چوتھی

تھیں۔ اسی مناسبت سے "رابعہ" یعنی چوتھی لڑکی آپ کا نام رکھا گیا۔ کسی نے آپ کے والد سے کہا کہ گھر میں اولاد پیدا ہو رہی ہے کہیں سے تیل مانگ لو۔ مگر ان کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا۔ اور یہی غیرت حضرت رابعہؒ کو ان سے ورثہ میں ملی۔ وہ پڑوسی کے گھر تک گئے مگر دروازہ کھٹکھٹانے اور تیل مانگنے سے پہلے تقاضائے غیرت سے مجبور ہو کر واپس چلے آئے۔ اسی حالتِ غم میں نیند آگئی۔ خواب میں بشارت ہوئی کہ اسی شہر بصرہ میں ایک شخص عیسٰی زادان ہے جو ہر شب سو مرتبہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتا ہے۔ ایک رات وہ درود بھیجنا بھول گیا۔ اس کے کفارے میں وہ اپنی حلال کی کمائی کے چار سو دینار تمہارے پاس بھیجے گا چنانچہ دوسرے دن عیسٰے زادان چار سو دینار لے کر خود آیا۔ اور آپ کے والدین نے ضروریات کی چیزیں خریدیں۔

حضرت رابعہؒ بصریہ کے بچپن کے حالات کا زیادہ پتا نہیں چلتا۔ لیکن قیاس یہ ہے کہ ایسے غیور اور حقیقی معنوں میں صاحبِ فقر والدین کے دامانِ تربیت میں انہوں نے بڑی اچھی تربیت حاصل کی ہو گی۔ غالباً اسی زمانے میں حضرت رابعہؒ اپنے آس پاس قناعت، فقر اور گوشہ نشینی کا ماحول دیکھتی ہوں گی۔

معلوم ہوتا ہے کہ خاندان کی مالی حالت بگڑتی ہی گئی۔ قحط اور خشک سالی کا دور دورہ رہا۔ بچپن ہی میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اور دوسری بہنیں بھی جدا ہو گئیں۔ آپ کی عمر دس ہی سال کی تھی کہ کسی ظالم نے پکڑ کر لونڈی بنا کے فروخت کر دیا۔ خریدار آپ کو گھر لے آیا اور آپ سے بہت محنت مشقت کا کام لینے لگا۔ یہ آپ کا سب سے بڑا امتحان اور سخت ترین ابتلا کا زمانہ تھا۔ شاید ہی کسی اور بزرگ کو غلامی کی ایسی سخت صعوبت برداشت کرنی پڑی ہو جو حضرت رابعہؒ کو کنیز بن کے برداشت کرنی پڑی۔ ایک دفعہ آپ کسی کام کے لئے جا رہی تھیں،

کسی نامحرم کو سامنے سے آتے دیکھ کر راستے سے ہٹنے لگیں اور گر پڑیں۔ آپ کا ایک ہاتھ ٹوٹ گیا۔ لیکن ان مصائب اور اس ابتلاء ہی نے آپ کے لئے باطنی اور روحانی ترقی کا راستہ صاف کیا۔ آپ نے سربسجدہ ہو کر دعا کی کہ یا اللہ اگرچہ میں غریب اور کنیز اور دست شکستہ ہوں لیکن مجھے اپنی مصیبتوں کی کوئی فکر نہیں۔ میں صرف تیری رضا کی طالب اور جویا ہوں۔

اس غلامی کے زمانے میں، تمام محنتوں اور مشقتوں کے باوجود آپ نے اپنے آپ کو اللہ تعالےٰ کی عبادت کے لئے وقف کر دیا۔ جتنا وقت بچتا نماز و وظائف میں صرف کرتیں۔ ہمیشہ روزہ رکھتیں۔ اکثر رات رات بھر عبادت کرتی رہتیں۔ ایک رات آپ سربسجدہ تھیں۔ آپ کے مالک کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ مکان کے تمام چراغ گل ہیں لیکن ایک کمرہ میں روشنی ہے۔ اور اس کمرے میں حضرت رابعہؒ سربسجدہ ہیں اور آپ کے سر کے قریب ایک معلق بقعۂ نور ہے۔ جس کی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ آپ سجدے کے عالم میں اللہ تعالےٰ سے عذر خواہی کر رہی تھیں کہ "خداوندا میں تیری مخلوق ہوں۔ لیکن تیری مرضی یہ تھی کہ میں تیرے ہی ایک بندے کی خریدی ہوئی لونڈی ہوں۔ اگر میں تیرے سوا کسی اور کی کنیز نہ ہوتی تو تیری عبادت کے لئے اتنی دیر میں حاضر نہ ہوتی اور ایک لمحہ بھی تیری عبادت سے غفلت نہ کرتی۔"

اکثر تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ حضرت رابعہؒ کا آقا یہ منظر دیکھ کر حیرت میں رہ گیا۔ اور جب اس نے حضرت رابعہؒ کے الفاظ سنے تو اس کے قلب پر رقت طاری ہوئی۔ اس پر خوفِ خدا نے غلبہ کیا۔ اور اس نے تہ دل سے توبہ اور استغفار کی کہ میں آئندہ سے کبھی اس برگزیدہ خاتون سے کوئی خدمت نہ لوں گا۔ اس نے دوسری صبح آپ کو آزاد کر دیا۔ اور کہا کہ آپ کی مرضی۔ اگر آپ چاہیں تو

یہاں رہیں اور یہیں آپ کی خدمت کو اپنے لئے عین سعادت سمجھوں گا۔ اور اگر آپ چاہیں تو کہیں اور رہیں۔ آزادی ملنے کے بعد آپ وہاں سے چلی آئیں۔ شہر کے غریب محلے میں ایک کچے سے تنگ و تاریک مکان میں قیام فرمایا اور اپنی زندگی کا ہر لمحہ اللہ تعالےٰ کی عبادت اور یاد کے لئے وقف کر دیا۔ آپ کو عبادت اور قربِ الٰہی کی وہ منزل مدت العمر حاصل رہی جس کے متعلق مولانا روم لکھتے ہیں ؎

اگر در عمرِ خود روزے دمے بے تو بسر بُردم
ازاں وقت وازاں ساعت زِ عمرِ خود پشیمانم

حضرت رابعہ بصریہ نے قربِ الٰہی کو حاصل کرنے کا جو راستہ ڈھونڈا تھا وہ شریعت و عبادت اور زہد کا تھا۔ طریقت اور تصوف کا نہیں حالانکہ دونوں راستوں کا منتہیٰ اور مقصود ایک ہے۔ چنانچہ یہ مشہور ہے کہ آپ دن بھر میں ایک ہزار رکعت نماز پڑھتیں۔ سال کا زیادہ تر حصہ روزہ رکھتیں۔ حضرت حسنؒ بصری کی خدمت، میں اکثر حاضر ہوتیں اور ان سے امورِ دینی و شرعی میں فیض حاصل فرماتیں۔ لیکن خود حضرت خواجہ حسنؒ بصری آپ کی بزرگی اور ولایت، کے بڑے معترف تھے۔

روایات کی روشنی میں آپ کی بزرگی کا اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح تائید ایزدی آپ کی امداد اور آپ کی روحانی تشفی کرتی۔ ایک مرتبہ آپ حج کے لئے تشریف لے جا رہی تھیں۔ ایک گدھے پر اسباب لدا تھا۔ راستے میں گدھا بیمار ہوا اور لوگوں نے سمجھا کہ مر گیا۔ قافلہ والے جو آپ کی بزرگی کے قائل اور معترف تھے اور آپ کی خدمت کو عین سعادت سمجھتے تھے۔ کہنے لگے کہ ہم آپ کا اسباب اٹھالیں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔ آپ نے ارشاد کیا کہ یہ تو

تمہاری مہربانی ہے۔ لیکن جب میں نے حج کا ارادہ کیا تھا تو مجھے اللہ تعالےٰ کی اعانت اور احسان پر بھروسہ تھا۔ اس کے بندوں کی اعانت اور احسان پر نہیں۔ قافلے والے جب اپنے اپنے خیموں کو چلے گئے تو آپ نے اللہ تعالےٰ سے دعا کی کہ میں تیرے احسان کی خواہاں اور عادی ہوں۔ مجھے اپنے بندوں کے احسان سے بچا۔ دوسری صبح کو گدھا اچھا ہو گیا اور اسی پر آپ کا اسباب لادا گیا۔

ایک اور مرتبہ جب آپ حج کے لئے تشریف لے گئیں تو سات سال عرفات میں گزارے۔ شیخ علی فارمدی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ ہاتف نے کہا کہ اے مدّعیہ یہ کیا طلب ہے جس نے تیرا دامن پکڑ لیا ہے۔ اگر تو میری خواہش مند ہے تو خواہش کر کہ میں تجلی کروں۔ حضرت رابعہؒ نے عرض کی اے میرے پروردگار غریب رابعہ میں اتنی طاقت نہیں کہ تیری تجلّی کا مشاہدہ کر سکے۔ میں صرف ایک نکتہ کی تہ تک پہنچنا چاہتی ہوں۔ یہ کہ فقر کیا شے ہے۔ جواب ملا کہ فقر ہمارا قہر ہے۔

آج ہمیں ان روحانی حقیقتوں کو سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ لیکن تمدنِ اسلام کے ظاہری اور باطنی ارتقا کے زمانے میں ان کی بڑی اہمیت تھی۔ بنو امیہ کے زمانے میں سلطنت اور جاہ و حشم کا اتنا چرچا تھا کہ فقر کی سخت اور سنگلاخ زمین پر چلنا، جو اللہ تعالےٰ کی صفتِ قہّاری کا ظہور تھا، بڑا مشکل تھا۔ اس راستہ پر بڑے بڑے بزرگوں کے قدم بڑی مشکل سے جمے رہتے۔ حضرت رابعہؒ جو ایک کمزور اور غریب عورت تھیں اس راستہ پر اس استغنا اور اس اطمینانِ قلب کے ساتھ چلتی رہیں، کہ اس کی نظیر دنیائے اسلام میں اور کہیں نہیں ملتی۔

رفتہ رفتہ اسی فقر میں آپ پر روحانی کشف و ادراک کے راستے کھلتے گئے۔ جن کا ظہور اکثر کرامات اور علمِ غیب کی صورت میں ہوتا۔ چنانچہ حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ اور دوسرے بزرگوں نے ان کا ایک معمولی سا واقعہ بیان کیا ہے۔ کہ ایک مرتبہ نو بھوکے آدمی آپ کے ہاں تشریف لائے اور کھانا مانگا۔ آپ کے پاس صرف دو روٹیاں تھیں۔ اتنے میں ایک سائل نے ندا دی اور آپ نے دونوں روٹیاں اٹھا کے سائل کو دے دیں۔ بھوکے مہمان حیران ہوئے۔ اتنے میں ایک لونڈی بہت سی روٹیاں لے کر آگئی۔ اور کہنے لگی ——— کہ بانو نے بھیجی ہیں۔ آپ نے روٹیاں گنیں تو کُل اٹھارہ روٹیاں تھیں۔ آپ نے لونڈی سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تو غلطی سے روٹیاں لے کر یہاں آگئی۔ تیری مالکہ نے تجھے میرے پاس نہ بھیجا ہوگا۔ لونڈی نے بہت کہا کہ نہیں آپ ہی کی خدمت میں بھیجا ہے۔ آپ نے نہ مانا اور روٹیوں سمیت لونڈی کو واپس کر دیا۔ اس پر آپ کے سارے بھوکے مہمان اور حیران ہوئے۔ تھوڑی دیر میں وہی لونڈی بیس روٹیاں لے کر واپس آئی۔ اس مرتبہ آپ نے گِنا تو پوری بیس روٹیاں نکلیں۔ آپ نے یہ روٹیاں اپنے مہمانوں کے آگے رکھ دیں۔ ان متحیّر مہمانوں نے کھانا کھا کر پوچھا کہ یہ کیا راز ہے۔ حضرت رابعہؒ نے فرمایا کہ جب تم لوگ آئے تو مجھے معلوم تھا کہ تم لوگوں نے کئی دن سے کھانا نہیں کھایا۔ میں نے خیال کیا کہ میرے پاس صرف دو روٹیاں ہیں۔ یہ نو مہمانوں کے آگے کیسے رکھوں۔ جب سائل آیا تو یہ روٹیاں میں نے اسے دے دیں۔ اور خدا نے کریم سے دعا کی کہ الٰہی تو نے ایک کا معاوضہ اسی دنیا میں دس دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اور مجھے اس بات پر یقین ہے۔ اسی لئے جب اٹھارہ روٹیاں آئیں تو میں سمجھ گئی کہ دو روٹیاں یا تو کنیز نے چرائی ہیں یا

بھیجنے والی نے غلطی کی ہے۔ اس لئے میں نے یہ روٹیاں واپس کر دیں۔ دوبارہ پوری بیس روٹیاں آگئیں۔

یہی وجہ تھی کہ حضرت حسنؒ بصری جن سے آپ کو شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ جب آپ کے فضائل کا ذکر کرتے تو کہتے میں نے اپنے آپ کو مفلس اور رابعہؒ کو مخلص پایا۔

رفتہ رفتہ عشقِ الٰہی آپ کے قلب وضمیر پر اس قدر حاوی ہو گیا کہ آپ کو دنیا تو دنیا بعض آدابِ دین کی بھی فرصت نہیں رہی۔ آپ کا ایک بڑا مشہور خواب اکثر مغربی اور مشرقی مورخین نے بیان کیا ہے کہ آپ نے حضرتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ آپ نے استفسار فرمایا کہ اے رابعہ تو مجھ کو دوست رکھتی ہے؟ آپ نے عرض کی یا رسول اللہ کون ہے جو آپ کو دوست نہیں رکھتا لیکن اللہ تعالےٰ کی محبّت نے مجھ کو اس قدر جکڑ لیا ہے کہ بجز اس کے کسی اور کی دوستی کی میرے دل میں جگہ نہیں رہی۔

حضرت رابعہ سے لوگوں نے استفسار کیا کہ بندہ کس طرح خوش ہو سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا جب محنت پر شکر کرے جیسا کہ نعمت پر شکر کرتا ہے۔ پھر پوچھا کہ گناہگار توبہ کرے تو قبول ہو گی یا نہیں؟ وہ توبہ جب ہی کرے گا جب اللہ تعالےٰ اس کو توبہ کی توفیق دے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ انسان آنکھوں کی راہ سے خدا کی منزل حاصل نہیں کر سکتا۔ زبان کی طرف سے بھی راہ نہیں مل سکتی۔ قوتِ سامعہ صرف سنتی ہے۔ ہاتھ پاؤں سراپا حیرت ہیں۔ معاملہ صرف دل کے ساتھ ہے۔ کوشش کرو تاکہ دل بیدار رہے۔ اگر دل بیدار ہے تو حق میں گم ہو جاتا ہے۔ اور یہی فنا فی اللہ کا مقام ہے۔

الغرض آپ نے اسی طرح حقیقی فقر اور عشقِ الٰہی میں عمر گزار دی۔ جب تک زندہ رہیں دوسرے زاہدوں، فقرا اور اولیاء کے لئے نمونہ رہیں۔ اور انتقال کے بعد سے آج تک آپ کا نام اولیائے کرام کی فہرست میں بڑی نمایاں جگہ لکھا جاتا ہے۔ جس فقر کا اقبال نے اپنے کلام میں بار بار ذکر کیا ہے وہ آپ کی ذات و صفات میں اپنے پورے جلال و جمال کے ساتھ نمایاں تھا۔ اس فقر نے آپ کو شاہ و گدا کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے نہیں دیا۔ کبھی زمانے کی سختیوں کی شکایت نہ کرنے دی۔ کبھی زہد و تقوے یا بزرگی کی وجہ سے تکبّر کو قریب نہ پھٹکنے دیا۔ اس فقر نے آپ کو سکھایا کہ حقیقی عظمت انکسار میں ہے۔ عبادت کا مقصد اپنے لئے عشقِ الٰہی اور دوسروں کے لئے شمعِ ہدایت بننا ہے۔ اگر کسی کا اپنا دل دُنیا کی پروا نہیں کرتا تو دنیا اُسے کوئی گزند یا تکلیف نہیں پہنچا سکتی۔ نہ ہاتھ توڑ کے۔ نہ حضرت یوسف علیہ السّلام کی طرح غلام بنا کے۔

حضرت خواجہ حسن بصریؒ اور حضرت رابعہؒ بصری کی بزرگ شخصیتوں نے اس زمانے میں اسلام کی روحانی اور باطنی قدروں کا تحفّظ کیا جب کہ یہ شدید نرغے میں تھیں۔ انہی سے اولیاء اللہ کا وہ مشہور و معروف سلسلہ شروع ہوتا ہے جن کی وجہ سے مراکو سے لے کر جاوا تک اسلام پھیلا۔ ان بزرگوں نے اس راز کو ہمیشہ کے لئے حقیقت بنا کر روشن کیا ـــ کہ سلطنت اور شان و شوکت اور فتوحات کا نام اسلام نہیں۔ اسلام وہ اندرونی طاقت ہے جو انسان کا رشتہ خدا سے استوار کرتی ہے۔ اور انسانوں کو دین و دنیا کا باہمی تعلّق سمجھاتی ہے۔

حضرت رابعہؒ بصریہ کے بعد ایران، ماورالنہر، عرب، افریقہ اور عالم اسلام کے ہر گوشے میں بزرگ خواتین نے آپ ہی کی زندگی کو اپنے لئے مشعلِ ہدایت سمجھا۔ اور آج بھی جب کوئی مسلمان عورت سربسجود ہوکر سجدہ سے سر اٹھاتی ہے تو حضرت رابعہؒ بصریہ کے فیضان کا ایک رتی برابر حصہ اس کے خشوع و خضوع اور اس کی عبادت میں بھی نمودار ہوتا ہے۔

ملکۂ نورجہاں

شہنشاہ ہند کی چہیتی ملکہ

نورجہاں کا نام برّعظیم پاکستان و ہند کے ہر پڑھے لکھے گھرانے میں بچے بچے کی زبان پر ہے۔ اس سرزمین میں کسی اور ملکہ کو ایسی شہرت اور مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ لیکن جس نورجہاں کی حکائتیں ہم عام طور پر سنتے رہے ہیں وہ اصلی نورجہاں نہیں تھی۔

ہم سب نے نورجہاں کی کہانیاں سنی ہیں۔ ایران سے ایک قافلہ آیا تھا جس میں نورجہاں کا باپ مرزا غیاث بھی تھا۔ اس کی لڑکی مہرالنساء نے شاہی محل میں پرورش پائی۔ ابھی وہ چھوٹی ہی سی تھی کہ خانہ باغ میں شاہزادہ سلیم نے دو کبوتر اس کے حوالے کئے، اور کہا دونوں ہاتھوں میں انہیں تھامے رہو۔ یہ اڑنے نہ پائیں اور خود کسی کام سے چلا گیا۔ ایک کبوتر اڑ گیا۔ جب شاہزادہ واپس آیا۔ اور اس نے پوچھا کہ ایک کبوتر کیا ہوا۔ مہرالنساء نے جواب دیا اڑ گیا۔ شاہزادے نے غصہ ہو کے پوچھا کیسے اڑ گیا۔ بھولے پن سے مہرالنساء نے دوسرا کبوتر بھی اڑا دیا۔ اور جواب دیا "یوں" شاہزادے کو یہ ادا بھا گئی۔ اور وہ لڑکپن ہی میں اس پر عاشق ہو گیا۔ لیکن اکبر نے نورجہاں کی شادی ایک سردار شیر افگن سے کر دی۔ جب شاہزادہ سلیم بادشاہ ہوا اور اس نے جہانگیر کا لقب اختیار کیا تو اسے مہرالنساء پھر یاد آئی۔ اس نے شیر افگن کو قتل کرا دیا۔ اور مہرالنساء کو اپنے محل میں طلب کیا۔ اور اُسے نور محل کا خطاب دیا۔ عرصے تک وہ اپنے شوہر کے سوگ

میں رہی، بالآخر جہانگیر سے شادی کرنے پر رضامند ہوگئی۔ اور اسے نورجہاں کا خطاب ملا۔ پھر اس نے گلاب کا عطر ایجاد کیا۔ اور جہانگیر کی موت کے بعد لاہور کے قریب ایک فقیرانہ مقبرے میں دفن ہوئی۔ یہ اصل میں انارکلی کی کہانی ہے جس کو ذرا بدل کے نورجہاں بنا دیا گیا ہے۔

یہ کہانیوں والی ایک نورجہاں ہے۔

کہانیوں والی دوسری نورجہاں وہ ہے جسے شبلی نعمانی نے بڑی مقبولیت بخشی اور جسے سہراب مودی نے اپنی فلم پکار میں نسیم کو اداکارہ بنا کے پیش کیا۔ یہ عدلِ جہانگیری کی شکار نورجہاں ہے۔ قصّہ یہ ہے کہ کسی نے نورجہاں کو بے پردہ دیکھ لیا۔ غیرتِ حسن سے بیگم نے طپنچہ مارا۔ جہانگیر کا عدل مشہور تھا۔ اس نے عدل کے لئے ایک زنجیر لٹکا رکھی تھی۔ جو فریادی دادخواہی کے لئے جب چاہتا اس زنجیر کو کھینچ لیتا۔ مقتول کے متعلقین نے جہانگیر سے بیگم کے خلاف عدل کی درخواست کی۔ اور جہانگر کا فیصلہ یہ تھا کہ خون کا بدلہ خون ہے۔ دوسرے امرا نے گزارش کی کہ قصاص کے سوا اور بھی تو شرعی حل ہیں۔ مثلاً خون بہا۔ مقتول کے متعلقین خون بہا لینے پر راضی ہوگئے اور نورجہاں کی جان بچ گئی۔ جہانگیر نورجہاں پر ہزار جان سے فریفتہ تھا۔ لیکن عدل کا مقام عشق سے بہت بالاتر تھا۔ جب نورجہاں بچ گئی تو وہ اس کے قدموں پر گر پڑا اور کہا ؎

توا گر کشتہ شدی آہ چہ می کردم من

یہ حکایت اس زمانے میں ریاسی وجوہ سے بھی مقبول ہوئی۔ شبلی بھی حالی اور اقبال کی طرح مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کے شاعر تھے۔ لیکن خالص تاریخی نقطۂ منظر سے دیکھا جائے تو ایسی حکائتیں ہماری تاریخ میں بہت ملتی ہیں۔ اب تاریخ نگاری ایک خالص سائنسی فن بن گیا ہے۔ جب تک کسی واقعے کا کامل ثبوت موجود نہ ہو

اسے تاریخی واقعہ ماننے میں تامل کرنا چاہیئے۔

اصلی نور جہاں اس دوسری نور جہاں سے بھی بہت مختلف تھی۔ میں نے خاص طور پر ان دونوں کہانیوں کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ اصلی نور جہاں کا کردار بھولے پن سے کبوتر اڑانے والی نور جہاں اور غیرتِ حسن سے طمنچہ مارنے والی نور جہاں کے مقابلے میں بہت زیادہ بلند، عظیم اور پیچیدہ تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس برِّ عظیم میں اور کسی ملکہ کو اتنی شہرت نصیب نہیں ہوئی۔

یہ صحیح ہے کہ مہر النساء کا باپ ایرانی نژاد تھا۔ اس کا نام غیاث بیگ تھا۔ اور اکبر کے زمانے میں اس نے مالگزاری کے نظم و نسق میں اچھا خاصا نام پیدا کر لیا تھا۔ جب جہانگیر بادشاہ ہوا تو اس نے غیاث بیگ کو ترقّی دے کر وزیرِ مال مقرر کیا۔ اور اسے اعتماد الدولہ کے خطاب سے سرفراز کیا۔ اعتماد الدولہ کا ایک بیٹا آصف خاں جہانگیر کے مقربانِ خاص میں سے تھا۔ اور اعتماد الدولہ کی لڑکی کی شادی ایک امیر سے ہو گئی تھی جس کا نام شیر افگن خاں تھا۔ ۱۶۰۷ء میں شیر افگن خاں مارا گیا۔ لیکن تاریخی طور پر کہیں اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ جہانگیر نے پہلے کبھی مہر النساء کو دیکھا تھا۔ اور وہ بچپن ہی سے اس پر عاشق ہو گیا تھا۔ یا یہ کہ جہانگیر کے حکم یا ایما سے شیر افگن کو قتل کیا گیا۔ بہر حال شیر افگن خاں کے قتل کے بعد مہر النساء کو اس کے باپ اعتماد الدولہ نے جہانگیر کی سوتیلی والدہ اور اکبر کی بیوہ سلیمہ بیگم کی رفاقت اور خدمت گزاری کے لئے بھیجا۔ جہانگیر نے مہر النساء کو سلیمہ بیگم کے پاس پہلی بار ۱۶۱۱ء میں جشن نوروز میں دیکھا۔ شیر افگن خاں کو مرے چار سال ہو چکے تھے۔ جہانگیر پہلی ہی نظر میں مہر النساء کا گرویدہ ہو گیا۔ دو ماہ کے اندر جہانگیر اور مہر النساء کی شادی ہو گئی۔ اور مہر النساء کو نور محل کا خطاب عطا ہوا۔ چند سال بعد اسے نور جہاں کا خطاب عنایت ہوا۔

نورجہاں کے خدوخال ایرانی حُسن کا نادر نمونہ تھے۔ مغل مصوّری کے شاہکاروں سے اب بھی اس کے حُسن و جمال کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس بے پناہ حسن کے ساتھ اس کے عادات و اطوار میں بلا کی دلکشی تھی۔ جن کا شہنشاہ جہانگیر روز بروز گرویدہ ہوتا گیا۔ یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ نورجہاں کا سارا خاندان بڑا ذہین، لائق اور باہنر تھا۔ اس کے باپ اور بھائی میں بھی تدبیر، سیاست اور نظم و نسق کی بڑی صلاحیت تھی۔ بیشک ان کے رُتبے اور منصب میں نورجہاں کے اثر کے باعث بہت جلد ترقی ہوتی گئی۔ لیکن وہ صحیح معنوں میں جہانگیر کی سلطنت کے رکنِ رکین بھی تھے۔ گلاب کا عطر نورجہاں کی نہیں بلکہ نورجہاں کی والدہ کی ایجاد ہے۔ جہانگیر بڑا نفاست پسند شہنشاہ تھا اور یہ عطر اسے بہت پسند آیا، اور اس کا رواج ملک بھر کے امرا میں بہت جلد عام ہو گیا۔

جہانگیر اور نورجہاں کی شادی کے سال بھر بعد جہانگیر کے دوسرے بیٹے خرم (شاہ جہاں) کی شادی آصف خاں کی لڑکی اور نورجہاں کی بھتیجی ارجمند بانو (ممتاز محل) سے ہو گئی۔ اور اس خاندان کا رسوخ اور اقتدار اور بڑھ گیا۔

شراب شہنشاہ جہانگیر کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ یوں تو اس کے دربار کے کسی امیر یا مقرب خاص کی مجال نہ تھی کہ ذرا سی شراب بھی چکھ کے دربار میں حاضر ہو۔ اگر کسی کے منہ سے شراب کی بدبُو آتی تو شہنشاہ کا سخت عتاب اس پر نازل ہوتا لیکن جہانگیر خود اپنی اس کمزوری کا شکار ہوتا گیا۔ شروع میں تو وہ ہلکی شرابیں پیتا رہا۔ نورجہاں ہمیشہ اسے اعتدال پر لانے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر ایک ایسا وقت آیا کہ ہلکی شرابوں میں جہانگیر کے لئے سرور باقی نہ رہا۔ اور اس نے تلخ اور تیز شرابیں پینی شروع کیں۔ اس کا جگر خراب رہنے لگا۔ اور صحت عام طور پر گری رہنے لگی۔ نورجہاں نے بڑی کوشش کر کے جہانگیر کو ان تلخ و تیز شرابوں کے بجائے پھر معمولی شرابوں کی طرف راغب کیا۔ کھانے میں بھی اس نے جہانگیر کو احتیاط

اور اعتدال کے راستے پر رکھنے کی کوشش کی۔ یہ غنیمت تھا کہ جہانگیر ہفتہ میں ایک دو روز گوشت ناغہ کرتا تھا۔ اور اسے خود بھی اپنی خورد و نوش کی کمزوریوں کا احساس تھا۔

جہانگیر کا خود یہ قول تھا، اور سب مورخین اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ اس نے ایک جام کے عوض سلطنت نورجہاں کے ہاتھ بیع کر دی تھی۔ لیکن محض اس وجہ سے اس کی خرابیٔ صحت کے دور میں سلطنت مستحکم رہی۔ نظم و ضبط اعتماد الدولہ اور آصف خاں کے قابل اور آزمودہ کار ہاتھوں میں تھا۔ سلطنت بھر میں سب سے زیادہ قابل سپہ سالار شاہزادہ خُرم تھا۔ جو آصف خاں کا داماد تھا۔ بارہ سال تک سلطنت کے استحکام کی کیفیت مستقل رہی۔ نورجہاں کا یہ سیاسی گروہ جہانگیر کے فرزندِ اکبر خسرو کے مقابل شاہزادہ خرم کے ولی عہد بنائے جانے کا حامی تھا۔ خسرو نے دو معمولی سی بغاوتیں کیں، مگر جہانگیر اسے بہت چاہتا تھا۔ دونوں بار اس نے خسرو کو معاف کر دیا۔

نورجہاں کے خاندان اور شاہزادہ خُرّم کے مخالفوں میں پیش پیش مہابت خاں تھا جو جہانگیر کے قابل ترین سپہ سالاروں میں تھا، مگر جسے آصف خاں اور نورجہاں کی مخالفت کی وجہ سے بارہ سال تک ترقّی نہ ملی۔

اس زمانے میں جہانگیر نے جو نئے سکّے جاری کئے اُن پر اس نے اپنے ساتھ نورجہاں کا نام کندہ کرایا۔ اس سے پہلے یا اس کے بعد برعظیم میں کسی اور ملکہ کو یہ عزّت نصیب نہیں ہوئی۔ گویا وہ تخت و تاج میں جہانگیر کی برابر کی شریک تھی۔ ان سکّوں پر بجائے مہینوں کے ناموں کے بارہ برجوں میں سے ایک کی تصویر ہوتی۔ اور عوام النّاس کا خیال تھا کہ یہ جدّت بھی نورجہاں ہی کی ہے۔ لیکن نورجہاں کے نام کے سکّے صرف اسی عروج کے زمانے میں جاری ہوئے۔ اور وہ بھی ایسے مقامات سے جہاں اس کے حامیوں کا زور تھا۔ اس کے علاوہ جہانگیر نے اپنی بھاری اشرفیوں کا نام ہی نورجہانی تجویز کیا۔

اس زمانے میں اکثر امورِ سلطنت ملکۂ نورجہاں اور اس کے عزیزوں اور حامیوں کے مشورے سے طے پاتے۔ شروع شروع میں نورجہاں کے اثر کی یہ صورت تھی کہ شہنشاہ اس کے مشورے کو سنتا اور اہمیت دیتا، مگر رفتہ رفتہ وہ اس کی طبیعت پر اس قدر حاوی ہوگئی کہ وہ جو کچھ کہتی وہی فرمانِ حکومت سمجھا جاتا۔ اسی زمانے میں انگلستان کے اسٹوارٹ بادشاہ جیمز اوّل کا سفیر سر تامس رو جہانگیر کے دربار میں باریاب ہُوا تاکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے مراعات حاصل کر سکے لیکن اس کی دال نہ گلی۔ بہت جلد اس پر ظاہر ہوگیا کہ شہنشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے سے پہلے ملکۂ نورجہاں اور شاہزادہ خرّم کی خوشنودی اور سرپرستی حاصل کرنی ضروری ہے۔

سنہ ۱۶۱۶ء میں جہانگیر نے شاہزادہ پرویز کو جو اپنے باپ کی طرح شراب کا دلدادہ تھا دکن سے الٰہ آباد بھیجا اور دکن کی حکومت اور سپہ سالاری شہزادہ خرّم کے سپرد کی۔ دکن میں مغلوں کا مدِّمقابل ملک عنبر تھا جس نے ایک حبشی غلام کی حیثیت سے زندگی شروع کی تھی لیکن رفتہ رفتہ اپنے زمانے کا قابل ترین مدبّر اور سپہ سالار بن گیا تھا۔ لیکن دکن میں شاہزادۂ خرّم کو غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ جہانگیر نے خوش ہو کر خرّم کو شاہ جہان کا خطاب دیا۔ اب شاہزادہ خرّم کی طاقت بہت بڑھ گئی۔ نورجہاں کو مستقبل کے متعلق اندیشہ ہونے لگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہجہان اس کے بھائی کا داماد تھا۔ لیکن نورجہاں اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ جہانگیر کے بعد اس حد تک اس کے زیرِ اثر نہیں رہ سکے گا جس حد تک جہانگیر تھا۔ سازشوں کا سلسلہ شروع ہُوا۔ ان میں سے پہلی کوشش یہ کی گئی کہ شاہزادہ خسرو کی شادی لاڈلی بیگم سے کر دی جائے۔ لاڈلی بیگم شیر افگن خاں اور نورجہاں کی لڑکی تھی۔ لیکن خسرو کو اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی۔ جو خان اعظم کی لڑکی تھی۔ اور وہ دوسری شادی

کرنے پر رضامند نہ ہوا۔ لیکن اس طرح سازشوں کے اس سلسلے کا آغاز ہوا جن کی وجہ سے پہلے نورجہاں اور شاہ جہان، پھر شاہ جہاں اور جہانگیر اور بالآخر نورجہاں اور اس کے بھائی آصف خاں ایک دوسرے کے مخالف بنتے گئے۔

نورجہاں اب بھی جہانگیر کے مزاج پر پوری طرح حاوی تھی۔ جہانگیر نے اپنی تزک میں ہر جگہ اس کا ذکر محبت سے کیا ہے۔ ۱۶۱۹ء میں فتح پور سیکری میں نورجہاں نے بندوق کی پہلی ہی گولی سے ایک شیر کا شکار کیا۔ جہانگیر نے اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس سے نورجہاں کی ہمت اور جرأت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

اسی سال جہانگیر نے اپنی صحت کی خرابی کے باعث کشمیر کا رخ کیا۔ نورجہاں ہمراہ تھی۔ کشمیر کے باغ آج بھی نورجہاں کے اثر کی گواہی دیتے ہیں۔

شاہ جہاں کے دل میں خسرو کی طرف سے ڈر تھا ہی۔ اس نے بلطائف الحیل خسرو کو دکن ساتھ لے جانے کی اجازت لی اور بڑے پُراسرار حالات میں خسرو کی موت واقع ہوئی۔ شاہ جہان نے جہانگیر کو جو معروضہ بھیجا اس میں درج تھا کہ مرض الموت کا باعث قولنج کا دورہ ہے۔ جہانگیر نے خلافِ معمول اپنی تزک میں بھی خسرو کی موت کے سبب پر کوئی رائے زنی نہیں کی۔ اب جہانگیر پہلے سے زیادہ شراب پینے لگا تھا۔ ملکہ نے بڑی کوشش کر کے اس کی شراب کم کرائی اور اس کی غذا میں مزید اصلاح کی۔

ملکۂ نورجہاں اگر شاہ جہاں سے نہ بگاڑتی تو شاید جہانگیر کے بعد بھی اس کا اپنے سوتیلے بیٹے پر کافی اثر رہتا۔ اور یہ امر تو یقینی ہے کہ جو خانہ جنگیاں اور بغاوتیں جہانگیر کی حکومت کے آخری دور میں ہوئیں وہ نہ ہوتیں۔ اور سلطنتِ مغلیہ اور زیادہ مستحکم رہتی۔ لیکن تاریخ میں ہمیشہ یہی ہوتا آیا ہے کہ جب کوئی صاحب دماغ اور اولوالعزم ملکہ حکومت اور طاقت پر تسلط پا لیتی ہے تو اس کی کوشش یہی رہتی ہے

کہ اپنے شوہر کے بعد بھی اس کا یہ تسلّط باقی رہے ۔ یہ انسانی اور نسائی فطرت ہے روس کی ملکہ کیتھرین عظمیٰ، برطانیہ کی الزبتھ اول، مصر کی ملکہ شجرۃ الدُّر اور ترکی کی ملکہ خرم، سب نے اس کی کوشش کی کہ حکومت اور سلطنت پر ان کا تسلّط قائم رہے سب سے زیادہ مہلک انجام ملکۂ شجرۃ الدّر کا ہُوا ۔ ترکی کی ملکۂ خرم کی ریشہ دوانیوں نے سلطنت عثمانیہ کو اس کے عین عروج کے زمانے میں بیخ و بنیاد سے ہلا دیا ۔ ان سب کے مقابلے میں نور جہاں کا رویّہ اور اس کا طرزِ عمل نہایت درجہ شریفانہ تھا۔ شاہ جہاں کی طاقت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ بغاوت کا اندیشہ تھا، اور نور جہاں جہانگیر کی حکومت اور تسلّط کو باقی رکھنا چاہتی تھی ۔ شاہ جہاں کی مخالفت کی وجہ محض یہی نہیں تھی کہ نور جہاں کو یہ اندیشہ تھا کہ جہانگیر کے بعد اگر شاہ جہان بادشاہ ہوگا تو اس کے اثر میں نہیں رہے گا ۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ اسے شُبہ تھا کہ اور زیادہ طاقت حاصل کر کے شاہ جہان خود اپنے باپ جہانگیر کے خلاف بغاوت کرے گا ۔ اور یہ اندیشہ بالکل صحیح ثابت ہُوا ۔ لیکن جہاں تُرکی کی ملکۂ خرم نے سازشوں سے اپنے سوتیلے اور ہردلعزیز فرزند مصطفٰے کو اپنے شوہر سلطان سلیمان عالی شان کو اکسا کے، اور صحیح غلط سمجھا کے، قتل کروا دیا ۔ نور جہاں کا دامن اس قسم کی مہلک سازشوں سے قطعاً پاک رہا ہے ۔ شاہزادے تو ایک طرف اس نے کسی امیر کو بھی اس قسم کا گزند نہیں پہنچایا کہ اس کے قتل کا فرمان نافذ کرواتی ۔ وہ دراصل سلطنتِ مغلیہ کا استحکام چاہتی تھی ۔ اور یہ سمجھتی تھی کہ استحکام کی یہی صورت ہے کہ اس کی اپنی زندگی میں عنانِ حکومت اسی کے اپنے ہاتھوں میں رہے ۔

چنانچہ اس نے خسرو کے انکار کے بعد لاڈلی بیگم کی شادی جہانگیر کے ایک اور لڑکے شہریار سے کرا دی ۔ جو ایک کنیز کے بطن سے تھا اور جس کی آوارگی اور شراب خواری کا شہرہ تھا ۔ مگر نور جہاں کا خیال تھا کہ شادی کے بعد وہ سنبھل جائیگا

اور بہر حال ہمیشہ اس کے اپنے زیر اثر رہے گا۔ اس رشتے کی وجہ سے شاہجہان نورجہاں سے کھٹک گیا۔ اسے یہ یقین ہو گیا کہ نورجہاں شہریار کو ولی عہد مقرر کروانا چاہتی ہے۔ پہلے دونوں بھائیوں میں رنجش ہوئی۔ پھر خانہ جنگی، نورجہاں کے اثر سے جہانگیر شاہ جہان سے ناراض ہوتا گیا۔ اور عتاب بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ شاہجہان نے کھلم کھلا اپنے باپ سے بغاوت کر دی۔ شاہ جہاں خود بڑا قابل سپہ سالار تھا۔ لیکن اپنے باپ کے خلاف بغاوت کرنے میں اکثر و بیشتر امرا اس کے خلاف ہو گئے۔ مہابت خاں جو عرصے سے آصف خاں کا مخالف تھا۔ اسے موقع مل گیا۔ اس نے جہانگیر اور نورجہاں کے حکم سے شاہ جہان کو پے درپے شکستیں دیں۔ اور شاہ جہاں نے ہار کے اپنے باپ سے معافی اور درگزر کی درخواست کی۔ یہ نورجہاں کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ اگر وہ چاہتی تو بڑی آسانی سے شاہ جہان کو قتل کروا دیتی۔ لیکن شاہ جہاں کو بغاوت کی کوئی سزا نہیں دی گئی۔ البتہ رہتاس اور اسیر کے قلعے اس کے قبضے سے لے لیئے گئے اور اسے دکن میں بالاگھاٹ کا گورنر مقرر کیا گیا تاکہ وہ دکن کی شوریدہ سرحد کے محاربات میں الجھا رہے۔ اور دوبارہ شہنشاہ کے خلاف بغاوت نہ کر سکے۔

اس عرصے میں مہابت خاں کا زور بہت بڑھ گیا تھا۔ وہ شاہزادہ پرویز کا معتمد خاص بن گیا تھا۔ اور اس نے شاہ جہان کی بغاوت فرو کی۔ آصف خاں اور مہابت خاں کی پرانی دشمنی تھی۔ نورجہاں کو اصلی خطرہ مہابت خاں سے نہیں بلکہ شہزادہ پرویز سے تھا، کیونکہ اب وہ شہریار کی ولی عہدی کے لیئے کوشاں تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی اور آصف خاں کی تحریک سے مہابت خاں پر عتاب نازل ہوا۔ اسے بنگال کا گورنر کر کے اس دور دراز صوبے کو بھیجنے کے احکام صادر کیئے گئے۔ اور مزید ذلیل کرنے کے لیئے ایک عامل کو بھیجا گیا کہ جو خزانہ

اس نے شاہ جہان کی بغاوت کے زمانہ میں جمع کیا ہے وہ اس سے حاصل کر کے فوراً خزانہ عامرہ میں داخل کر دیا جائے۔

مہابت خاں جان پر کھیل گیا۔ اس کے دشمن آصف خاں نے خود اس کے لئے ایک خداداد موقع فراہم کر دیا۔ شہنشاہ اور ملکہ کی سواری کابل جا رہی تھی۔ آصف خاں لشکر کے بڑے حصّے کو لے کر دریا کے پار اتر گیا۔ شہنشاہ اور ملکہ چند دستوں کے ساتھ پیچھے رہ گئے۔ وہ دریا پار کرنے ہی والے تھے کہ مہابت خاں نے اپنے چند جاں نثار دستوں کی مدد سے دریا کے کنارے اور کشتیوں پر قبضہ کر لیا۔ اور شہنشاہ کو اسیر کر لیا۔ شہنشاہ جہانگیر نے اس واقعہ کو بڑی تفصیل سے اپنی تزک میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ پہلے میں نے ارادہ کیا کہ اس نابکار کے وجود سے صفحۂ ہستی کو پاک کر دوں۔ پھر مصلحتِ وقت سمجھ کر خاموش ہو گیا۔ مہابت خاں کا رویّہ شروع سے آخر تک ٹوڈیانہ رہا۔ وہ اسے اسیر کر کے اپنے خیموں میں بھی لے گیا تو اس طرح کہ سب پر ظاہر ہوا کہ شہنشاہ شکار کھیلنے جا رہا ہے۔ مہابت خاں اُجڈ سپہ سالار تھا مدبّر نہیں تھا۔ اس نے شہنشاہ کو تو اسیر کر لیا مگر اس کی غفلت سے ملکۂ نور جہاں کو اس کا موقع مل گیا کہ وہ دریا کے پار پہنچ گئی۔ اور اپنے بھائی آصف خاں اور دوسرے امرا کو لعنت ملامت کی اور غیرت دلائی کہ وہ اس مفسد اور باغی سپہ سالار کے چنگل سے شہنشاہ کو چھڑا لائیں مہابت خاں نے شہریار کو بھی اسیر کر لیا۔ اور دوسرے دن جب آصف خاں اور اس کے امرا نے دریا کے ساحل پر مہابت خاں کے خلاف فوج کشی کی تو شکست کھائی۔ آصف خاں سیاست اور تدبّر کی شطرنج کا ماہر تھا لیکن میدانِ جنگ میں وہ اپنے حریف مہابت خاں کے سامنے بے بس تھا۔ مہابت خاں جنگ کے میدان کا غازی تھا لیکن تدبّر اور سیاست سے محض بے بہرہ۔ شروع میں

آصف خاں کو شکست ہوئی اور آخر میں مہابت خاں کا زور خود بخود ٹوٹ گیا۔

صرف نورجہاں نے اور اس کے ساتھ ایک دستہ نے جم کر مہابت خان کا مقابلہ کیا۔ لیکن اس کا ہاتھی تیر کھا کے زخمی ہو گیا۔ آصف خاں نے بھاگ کے اٹک کے قلعے میں پناہ لی اور پھر جان کی امان پا کے مہابت خاں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔

شہنشاہ کی سواری آہستہ آہستہ کابل کی جانب روانہ ہوئی اور مہابت خاں جو اب سیاہ و سفید کا مالک تھا شہنشاہ اور ملکہ سے بڑی اطاعت و فرمانبرداری کے ساتھ پیش آتا رہا۔ لیکن مہابت خاں کا اصل زور مارچ ۱۶۲۶ء سے لے کر مئی ۱۶۲۶ء تک کل تین مہینے رہا۔ کابل پہنچنے کے بعد ملکۂ نورجہاں کی فراست اور حکمتِ عملی سے مہابت خاں کا زور خود بخود ٹوٹنے لگا۔ سب سے پہلے مہابت خاں کے افغان دستے اس سے منحرف ہونے لگے۔ اس درمیان میں مہابت خاں نے شہنشاہ کی طبیعت میں درخور حاصل کر لیا تھا۔ لیکن ملکہ نورجہاں نے آہستہ آہستہ اس کے اثر کو بالکل ختم کر دیا۔ نومبر ۱۶۲۶ء میں سواری شاہانہ کابل سے لاہور واپس ہوئی اور مہابت خان کو ایک منزل آگے آگے چلنے کا حکم ملا۔ مہابت خاں کو اب یہ اندازہ ہو گیا کہ اس کی طاقت اور اثر کے زوال کا زمانہ آ گیا ہے۔ فوراً لاہور روانہ ہو گیا۔ مگر احتیاطاً آصف خاں اور جہانگیر کے دو بھتیجوں کو بطور یرغمال اپنے ساتھ لیتا گیا۔

ادھر مہابت خاں کا زور ٹوٹا اور ادھر دکن سے ملک عنبر کی وفات کی خبر آئی، جو مغلوں کے مخالفین میں قابل ترین سپہ سالار تھا۔ مہابت خاں نے بھاگ کر شاہ جہاں کے پاس پناہ لی۔ لیکن اب اس کے پاس صرف دو ہزار سپاہی رہ گئے تھے۔ شاہ جہان بھی علیل رہنے لگا تھا، اور بغاوت کے بعد اس کا زور

ٹوٹ چکا تھا۔ شاہ جہاں اور مہابت خاں دونوں جہانگیر کے دورِ حکومت کے بہترین سپہ سالار تھے۔ لیکن دونوں کی طاقت ٹوٹ چکی تھی۔

بظاہر یہ آثار تھے کہ ہر طرف نورجہاں کے حریفوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی تھی۔ لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ جہانگیر کی زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے۔ ۱۶۲۷ء میں اس کی صحت پھر بہت بگڑ گئی۔ اس مرتبہ کشمیر کی آب وہوا سے بھی کوئی افاقہ نہ ہوا۔ خزاں کے موسم میں جب شاہانہ سواری پیر پنجال کے پہاڑوں کو پار کر رہی تھی شہنشاہ جہانگیر نے شکار کا حکم دیا۔ ایک سپاہی ایک زخمی ہرن کا پیچھا کرتے کرتے پہاڑ سے پھسل کے اس طرح گرا کہ اس کا جسم چور چور ہو گیا۔ شہنشاہ اس منظر کو نہ بھول سکا۔ نورجہاں ساتھ تھی۔ آخر دم تک جہانگیر کی تیمارداری کرتی رہی۔ لیکن وہ جانبر نہ ہو سکا اور ۷ نومبر ۱۶۲۷ء کو اس بُردبار اور صاحبِ ذوق شہنشاہ نے اس دنیائے فانی سے رحلت فرمائی۔

فوراً ہی ملکہ نورجہاں اور اس کے بھائی آصف خاں میں مخالفت شروع ہو گئی۔ اس مخالفت کی ذمہ داری آصف خاں پر عائد ہوتی ہے۔ اس نے پہلے تو اپنی بہن ملکہ نورجہاں کو حراست میں لے لیا۔ وہ کھلم کھلا اپنے داماد شاہ جہان کی طرف داری نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے ادھر تو خسرو کے قانوناً محبوب فرزند داور بخش کو شہنشاہ بنانے کا اعلان کیا ادھر شاہی مُہر اور معروضات در پردہ شاہ جہان کے پاس بھیجے۔ ادھر نورجہاں کے اشارے پر شہریار نے لاہور میں اپنی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ لاہور کا خزانہ سپاہیوں میں تقسیم کر دیا۔ لیکن اس کی فوج آصف خاں کے مقابلے میں پسپا ہو گئی۔ شہریار نے اپنے حرم میں پناہ لی اور حرم کے خواجہ سراؤں نے اسے پکڑ کے

آصف خاں کے حوالے کر دیا۔ آصف خاں نے اسے قید کر کے اس کی آنکھیں نکلوالیں۔

شاہ جہاں نے جلد ہی دکن سے کوچ کر کے آگرہ کا رخ کیا۔ اور یہاں اپنی تخت نشینی کا اعلان کیا۔ اور سب شاہزادے قتل کئے گئے لیکن شاہ جہان نے ملکۂ نور جہاں سے بہت عزّت واحترام کا سلوک کیا۔ اسے ملکہ کے ابتدائی دور کے احسانات کا احساس تھا۔ اس کے علاوہ ملکہ کی اپنی کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی۔ ملکہ کا قریب ترین عزیز اور بھائی آصف خاں اس کا اپنا خسر اور حامی تھا۔ اسے اب ملکہ نور جہاں سے کوئی اندیشہ نہ رہا تھا۔ اس نے ملکۂ نور جہاں کے لئے بڑی فیّاضی سے گزارے اور کثیر پنشن کا انتظام کیا۔

اب اس عالی قدر اور عالی شان ملکہ کا دل دنیا سے اچاٹ ہو چکا تھا لاہور میں وہ بڑی سادگی سے رہتی اور وظیفہ کی کثیر رقم جو اسے ملتی وہ غریبوں کی امداد صدقہ وخیرات اور داد ودہش میں صرف کر دیتی۔ لاہور کے قریب شاہدرہ میں وہ اپنی نگرانی میں جہانگیر کا مقبرہ بنوا رہی تھی جو آج بھی شاید پاکستان بھر کی سب سے حسین اور خوبصورت عمارت ہے۔ اب ملکہ کو صرف یہی ایک دھن تھی کہ جس شہنشاہ کی شریکِ حیات بن کے اس نے اس برِّ عظیم پر حکومت کی تھی اس کی آخری آرامگاہ بنوانے میں اپنا سارا وقت گزار دے۔

بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ مغل طرزِ تعمیر پر نور جہاں کے بھی اتنے ہی احسانات ہیں جتنے اس کے سوتیلے بیٹے شاہ جہاں نے کئے ہیں۔ جہانگیر کے مقبرے کا خاکہ تو غالباً اس شہنشاہ کی اپنی پسند کا تھا، اور اس میں نور جہاں کی تعمیری صلاحیت اور قابلیت کا اتنا زیادہ اندازہ نہیں ہوتا جتنا اعتماد الدولہ کے مقبرے سے ہوتا ہے۔ اپنے باپ اعتماد الدولہ کے مقبرے

کے خاکے کی تجویز اور تکمیل میں نور جہاں نے جدّت اور جمال آفرینی کا جو نمونہ پیش کیا ہے اس کی مثال سارے مغل فنِ تعمیر میں نہیں ملتی۔ یہ مقبرہ ایک عورت کی نفاست پسندی کا آئینہ دار ہے۔ اس کے طرزِ تعمیر میں بڑا ستھرا پن اور بڑی نزاکت ہے۔ مقبرہ کی عمارت دوسری مغل یادگاروں کے مقابل چھوٹی سی ہے اصل عمارت کا عرض کل ۶۹ فیٹ ہے۔ پورا مقبرہ اُجلے سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ اندر جواہرات کی پچّی کاری ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک مرصّع زیور ہے جسے عمارت کی شکل دی گئی ہے۔ مقبرے کی سفیدی باغ کے صنوبروں کی سبزی اور چہار دیواری کی سرخ دیواروں کی ضد معلوم ہوتی ہے۔ ایک رُخ پر دریا ہے۔ باغ کے حوض بڑے حسین معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان کے درمیان مقبرہ ایک نگینے کی طرح جڑا ہوا ہے۔ سنگِ مرمر کی جالیوں سے نازک روشنی چھن چھن کر مقبرے کے اندر تک پہنچتی ہے۔ سنگ مرمر پر رنگین مرصّع پچّی کاری بڑی حسین معلوم ہوتی ہے۔ فن کاری اور تعمیر کے لحاظ سے اعتماد الدولہ کا مقبرہ مغل دورِ حکومت کے احساسِ جمال کا دلکش ترین نمونہ ہے۔ اس میں تاج محل کی سی عظمت و شوکت نہیں لیکن اس میں وہ نسوانی نزاکت و نفاست ہے جو نور جہاں کے کردار کا ایک حصّہ اور نمونہ ہے۔ یہ مغل طرزِ تعمیر کا وہ پہلا نمونہ ہے جو خالص سنگِ مرمر سے تعمیر ہوا۔ تاج محل کے طرزِ تعمیر پر اس مقبرے کے حُسن اور اس کے اسلوبِ آرائش کا بڑا اثر ہے۔

جہانگیر کے مرنے کے بعد نور جہاں اٹھارہ سال زندہ رہی۔ اگر وہ چاہتی تو اپنے لئے بھی ایسا ہی نازک اور نفیس مقبرہ بنوا سکتی تھی۔ جیسا اس نے اپنے باپ کے لئے بنوایا تھا یا جیسا وہ اپنے شوہر کے لئے بنوا رہی تھی ——

شاہ جہان اس کے مصارف کے لئے بڑی فیّاضی سے رقم بھیجا کرتا تھا۔ لیکن اس دل کش ترین ملکہ نے اپنی یادگار صرف بنی نوع انسان کے دلوں اور دماغوں میں چھوڑی۔ اور بڑے ہی سیدھے سادے سے مقبرے میں دفن ہوئی۔ آج بھی ہر پاکستانی عورت کے دل میں نورجہاں کی عظمت و محبت کا چراغ روشن ہے۔ اپنی موت کے بعد بھی سینکڑوں سال تک، اور آج تک ملکۂ نورجہاں اس سرزمین کے رہنے والوں کے دلوں پر حکومت کرتی رہی اور آج بھی کر رہی ہے:۔

حضرت محل

مجاہدہ

اُنیسویں صدی کے نصف اول میں دربار لکھنؤ کا تصور کیجئے۔ ہر طرف عیش پرستی کا دور دورہ تھا۔ دربار زوال آمادہ تھا۔ امانت کی اندر سبھا، اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ کی زندگی کی آئینہ دار تھی۔ جیسے کچھ حالات نصیرالدین حیدر کے زمانے میں تھے۔ اس کے بعد سے ان میں کوئی اصلاح نہ ہوئی تھی۔ بلکہ حالات بد سے بدتر ہی ہوتے جا رہے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی ہوسِ ملک گیری کے آخری دور سے گزر رہی تھی۔ لارڈ ولزلی بڑے دھڑلے کا گورنر جنرل تھا۔ آخر وہ ڈیوک آف ویلنگٹن کا بھائی ہی تھا۔ لیکن اس کی پالیسی یہ تھی کہ دیسی ریاستوں کے حالات کی اصلاح کی بجائے انہیں براہ راست کمپنی کی قلم رَو میں شامل کر لینا چاہیئے۔ اس پالیسی کے نتائج بڑے مہلک نکلے۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک و جنگ آزادی کے جہاں اور بہت سے اسباب تھے، وہاں یہ بھی ایک بہت بڑا سبب تھا۔ خاص کر اودھ میں کمپنی بہادر کے خلاف بغاوت کی اصلی وجہ یہ ہوئی کہ واجد علی شاہ کو تخت سے محروم کر کے کلکتہ بھیج دیا گیا تھا۔ اور ریزیڈنٹ کی حکومت براہ راست قائم ہو گئی تھی۔

دسمبر ۱۸۴۸ء میں غدر سے نو سال پہلے واجد علی شاہ کی نظر ایک نوخیز لڑکی پر پڑی۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ خد و خال متناسب تھے، آنکھیں بڑی بڑی تھیں

ناک سیدھی، اور دہانہ چھوٹا سا تھا۔ اس لڑکی کا نام امراؤ تھا۔ واجد علی شاہ کو یہ لڑکی بے حد پسند آئی۔ چنانچہ انہوں نے امراؤ کو اپنی ملکہ بنا کر "حضرت محل" کا خطاب عطا کیا۔

شادی سے پہلے امراؤ "شاہی پری خانے" میں رقص و سرود کی تعلیم حاصل کرتی تھی۔ شادی کے بعد وہ پردوں میں بند رہی۔ اس کی سواری نکلتی بھی تو بند پالکی میں، چاؤش آگے آگے اور قلماقنیاں نیزے سنبھالے ہوئے ساتھ ساتھ چلتیں۔ اس نے باہر کی دنیا نہ دیکھی تھی اور نہ اسے باہر کی دنیا کا کوئی خاص تجربہ تھا۔ لیکن اس کی اولوالعزمی اور عالی ہمتی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

اگر لکھنؤ کے حالات سازگار رہتے۔ جانِ عالم واجد علی شاہ برابر تخت پر متمکن رہتے۔ اور ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ نہ ہوتا تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آج حضرتِ محل کا نام بھی کسی کی زبان پر ہوتا یا نہیں۔ یا اسی طرح پری خانے اور محل اور پالکی کے اندر ہی اندر دوسری بہت سی باہمت عورتوں کی طرح رہتی۔ اور ایک دن اپنے عزم اور ہمت کے جوہر دکھائے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو جاتی۔ غیر معمولی شخصیتیں اکثر غیر معمولی حالات میں ابھرتی ہیں اور تاریخ کے صفحوں پر نمودار ہوتی ہیں۔ واقعات ایسے پیش آئے کہ حضرتِ محل کو تاریخ پر اپنا نقش چھوڑنے کا موقع مل گیا۔ اگرچہ یہ نقش مبہم ہی سا ہے۔

غدر سے کچھ ہی عرصہ قبل انگریزوں نے واجد علی شاہ کو کلکتہ بھیج دیا تھا۔ اس کی وجہ سے لکھنؤ میں ہیجان تو تھا ہی۔ کوئی تمدن بلا آخری مقابلہ کئے ہوئے ختم نہیں ہوتا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ انجام غالباً ناموافق ہوگا۔ لکھنؤ نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کا اسی طرح مقابلہ کیا جیسے حیدر آباد دکن نے ۱۹۴۸ء میں ہندوستانی حملہ آوروں کا۔ اور اس مقابلے میں اہل لکھنؤ کی سرداری حضرتِ محل کے حصّے میں

آئی۔ یہ حصہ انہیں ملا نہیں بلکہ انہوں نے اپنی جرأت اور ہمت سے خود حاصل کیا۔

جب میرٹھ سے جنگ آزادی کی آگ پھیلی تو بڑی سرعت سے سارے برّصغیر ہند و پاکستان میں پھیل گئی۔ مولوی احمداللہ شاہ اس کی تنظیم پہلے ہی سے کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عظیم اللہ نے اس کی کوشش کی کہ دربارِ دہلی کے شہنشاہی سایہ میں ساری پرانی سلطنتیں پھر سے اپنے قدموں پر کھڑی ہو جائیں۔ نانا راؤ پیشوا نے کانپور سے پونا تک کے علاقے پر جو مرہٹہ گردی کا میدان رہ چکا تھا۔ اپنی سلطنت قائم کرنا چاہی۔ دھلی کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو سپاہیوں کے اصرار پر حکومت قبول کرنا پڑی۔ واجد علی شاہ کلکتہ میں نظر بند تھے۔ ان کا تو کلکتہ سے لایا جانا مشکل تھا۔ کیونکہ کلکتہ کمپنی بہادر کی راج دھانی تھی، امرائے دربار کو یہ فکر ہوئی کہ ولی عہدِ سلطنت مرزا دارا سطوت کو تخت نشین کر دیا جائے۔ جن امراء نے یہ تجویز پیش کی تھی ان میں مرزا علی رضا کوتوالِ شہر، راجہ جے لال سنگھ، میرنا در حسین اور محمد قاسم خاں شامل تھے۔ مگر ان میں سب سے زیادہ با اثر میر واجد علی خاں تھے جو عام طور پر ممّو خاں کہلاتے تھے۔

امرا نے کمپنی بہادر کے خلاف جو بغاوت کی اس کے تین اسباب تھے ایک تو یہ کہ واجد علی شاہ کی جلاوطنی اور نظر بندی ان کی اپنی تباہی اور بربادی تھی دوسرے یہ کہ تحریک آزادی کی آگ سارے ملک میں بھڑک رہی تھی۔ اور یہی ان کے لئے اودھ میں دوبارہ بادشاہت قائم کرنے کا موقع تھا۔ اور تیسری اور آخری وجہ یہ تھی کہ مئی ۱۸۵۶ء میں سب سے پہلے آغا مرزا کمبل پوش نے دو سو مجاہدین کے ساتھ محمدی جھنڈا بلند کیا تھا۔ ریزیڈنٹ بہادر نے نہ صرف انہیں گرفتار کر لیا اور آغا مرزا اور ان کے درجن بھر ساتھیوں کو پھانسی دے دی بلکہ ساتھ ہی ساتھ غالباً اس خوف سے کہ بغاوت کی آگ بھڑکنے نہ پائے یہ حکم بھی جاری کر دیا کہ

لکھنؤ کے امرا اور شاہی خاندان کے ہتھیار ضبط کر لئے جائیں۔ لکھنؤ میں ہیجان پھیل گیا۔ اور مئی کے اواخر تک کئی رجمنٹوں نے انگریزوں کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کر دی۔

مرزا علی رضا، راجہ جے لال سنگھ، نصرت جنگ اور دوسرے امرا پہلے نواب ملکۂ عہد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جو ولی عہد مرزا دارا سلوت کی والدہ تھیں۔ اور پیش کش کی کہ ولی عہد کو بادشاہ بنا دیجئے۔ ملکۂ عہد نے جواب دیا کہ نواب شجاع الدولہ جو سلطنت اودھ کے بانی تھے، انگریزوں کے مقابلے میں نہ جیت سکے اب ان سے مقابلہ کر کے کیا حاصل ہوگا۔ امراء نے تین لاکھ روپیہ لوازمِ شاہی کے لئے ملکۂ عہد سے مانگا تھا وہ بھی انہوں نے دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ان امرائنے واجد علی شاہ کی دوسری ملکہ نواب خاص محل کی خدمت میں حاضر ہو کے ان سے عرض کی کہ مرزا نوشیرواں قدر کو جو عمر میں ولی عہد بہادر سے بھی بڑے ہیں تخت نشین ہو کر انگریزوں کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ نواب خاص محل نے بھی انکار کر دیا۔ اس کے بعد نواب شمشیر الدولہ بہادر کے مشورے سے یہ طے پایا کہ واجد علی شاہ کے سب سے چھوٹے شہزادے برجیس قدر کو تخت نشین کیا جائے جو حضرت محل کے بطن سے ہیں۔ چنانچہ یہ سب امراء حضرت محل کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ وہ انگریزوں سے مقابلہ کرنے کے لئے اور سلطنتِ اودھ کو از سرِ نو قائم کرنے کے لئے شاہزادہ برجیس قدر کو بادشاہ بنانا چاہتے ہیں

حضرتِ محل میں غضب کی ہمت، جرأت اور جوانمردی تھی۔ ان صفات کا تقاضا تھا کہ منظرِ عام پر آئیں۔ اس بہادر عورت نے دیکھا کہ اس تجویز سے اس کا اپنا، اس کے بیٹے کا اور لکھنؤ کا مستقبل روشن ہو سکتا ہے۔ اگرچہ یہ تجویز بہت خطرناک تھی۔ انہوں نے ملکۂ عہد اور ملکۂ خاص محل کی طرح ہمت نہ ہاری۔ بلکہ یہ کہا کہ آپ

صاحبوں کی جو رائے ہو مجھے منظور ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میرا بچّہ اپنے باپ اور اپنے وطن کو آزادی دلائے گا۔ چنانچہ ۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو شام کے ۶ بجے قصرِ خاقان میں مرزا برجیس قدر کو تخت نشین کیا گیا۔ قیصر التواریخ میں تخت نشینی اور اس کے بعد کے حالات تفصیل سے درج ہیں۔ نواب ممّو خاں نے جن کا حضرت محل کے دربار میں بڑا رسوخ تھا۔ مرزا برجیس قدر کو تخت پر بٹھایا۔ جے لال سنگھ نے مندیلِ شاہی سر پر رکھی۔ پرانا لکھنؤ پھر سے زندہ ہو گیا۔ شعرائے کرام نے مرصّع قصیدے پڑھے۔ عمائد شہر نے نذریں پیش کیں۔ جہانگیر بخش صوبہ دار توپ خانہ کے حکم سے دوست محمد خاں افسر گولنداز نے ۲۱ ضرب سلامی کی توپ سر کی۔ شرف الدولہ کو نیابت کا عہدہ اور خلعت ملا۔ مرزا علی رضا کو کوتوال اور حسام الدولہ کو جرنیل مقرر کیا گیا۔ سب سے زیادہ رسوخ میر واجد علی خاں عرف ممّو خاں کو حاصل ہوا جو دیوانِ خاص کے داروغہ مقرر ہوئے۔

چونکہ برجیس قدر بہت صغیر سن تھے۔ اس لئے نواب حضرتِ محل نائب السلطنت مقرر ہوئیں۔ اور حکومت کا انتظام انہوں نے اپنے ہاتھوں میں سنبھالا۔ اودھ کے تعلقہ داروں کے نام حکم نامہ روانہ کیا گیا جس کی عبارت یہ تھی:۔

"ملکِ آبائی خدا نے اب ہم کو عطا کیا۔ دفعِ کفّارِ فرنگ لازم ہے باہم شریک ہو کر باقی ماندگاں ہیلی گارد کو قتل کر دو۔ جو اُن کو قتل کرے گا اس کا نصف علاقہ اس کو معاف ہو گا۔"

اودھ بھر میں ۱۸۵۷ء بھر کی تحریکِ بغاوت تیزی سے پھیل گئی۔ مولوی ذکاء اللہ نے اس صورتِ حالات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"صرف گیارہ دن میں اودھ کے کسی ضلع میں برٹش گورنمنٹ کی طرف سے کوئی حاکم نہ تھا اور انگریزی عملداری خواب معلوم ہوتی تھی۔"

اور سر ہنری لارنس کے الفاظ ہیں :۔

"سارے اضلاع ہماری حکومت سے نکل گئے ہیں اور حالت روز بروز بگڑتی جاتی ہے۔ تعلقہ دار مسلح ہو رہے ہیں اور بعض نے دیہات پر قبضہ کر لیا ہے۔"

خاص لکھنؤ میں حضرت محل خود بنفس نفیس گھوڑے پر سوار ہو کے جنگ کے لئے نکلتیں۔ ان کو دیکھ دیکھ کر مردوں کی ہمتیں بڑھتیں۔

اسی زمانے میں لکھنؤ میں ایک درویشِ مردِ مجاہد آیا اور لکھنؤ اور اودھ کی جنگ آزادی میں اگر کسی کا نام حضرتِ محل کے برابر ہی برابر بلکہ ان سے زیادہ عزت اور توصیف کا مستحق ہے تو وہ اس درویش کا ہے یہ مولوی احمد اللہ شاہ تھے۔ اور عجیب وغریب صفات کے آدمی تھے۔

مولوی احمد اللہ شاہ مدراس کے رہنے والے تھے۔ اور تاجداران گولکنڈہ کی اولاد سے تھے۔ وہ ۱۸۰۶ء کو ٹیپو سلطان کے مرنے کے سات سال بعد پیدا ہوئے علومِ دینیہ کے ساتھ سپہ گری میں مہارت حاصل کی۔ پہلے حیدر آباد دکن آئے یہاں شادی کی۔ بیوی کے مرنے کے بعد دکن کو خدا حافظ کہا اور طویل سیر و سیاحت شروع کی۔ انگلستان کا سفر کیا۔ یہاں انہوں نے انگریزوں کو اپنے وطن میں دیکھا اور آزادی اور جمہوریت کا مغربی مفہوم سمجھا۔ پھر یورپ سے ہوتے ہوئے استانبول آئے۔ حج بیت اللہ کیا۔ ایران اور افغانستان کا سفر کیا۔ کئی سال تک راجستان میں ریاضت کرتے رہے۔ گوالیار کے ایک بزرگ محراب شاہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ محراب شاہ جہاد کی تلقین کرتے رہے کیونکہ خود ان پر سید احمد شہیدؒ اور سید اسماعیل شہیدؒ کی تعلیمات اور زندگی کا اثر تھا۔ گوالیار سے مولوی احمد اللہ شاہ آگرہ آئے اور اس شہر کو اپنا مرکز بنایا۔ یہاں وہ تبلیغ اور تلقین کرتے۔ ہفتے میں دو روز ان کا تبلیغی جلوس نکلتا جس کے

آگے نقارہ بجتا ہوتا۔ یہاں وہ ڈنکا شاہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ پھر لکھنؤ آ کے انہوں نے گھسیاری منڈی میں اقامت اختیار کی۔ اہل لکھنؤ اپنے بادشاہ کی اسیری کے بعد انگریزوں پر خار کھائے بیٹھے تھے۔ اس لئے مولوی احمد اللہ شاہ کو یہاں اپنی تحریک کو تنظیمی شکل دینے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ مختلف شہروں میں ان کے حامی اور مددگار تھے۔ انہوں نے خفیہ خط و کتابت کے ذریعے لوگوں کو انگریزوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا۔ ان کی تحریریں اودھ بھر میں تقسیم ہوتیں۔ اپریل ۱۸۵۷ء میں انگریز افسروں نے ان پرچوں کے متعلق تحقیق شروع کی۔ ان سے اس طرح کی تنظیم کا پتا چلتا تھا جس کی انگریزوں کو توقع نہ تھی۔ مولوی احمد اللہ شاہ کو گرفتار کیا گیا اور پھانسی کی سزا مقرر ہوئی۔ جب مولوی صاحب پابند سلاسل ہو کے زندان کو گئے تو ان کی پیشانی پر شکن تک نہ تھی۔ تبلیغ کا سلسلہ جاری تھا۔ اور ان کا قید خانہ دربار میں بدل گیا پھانسی ملنے سے پہلے ہی حضرتِ محل نے اودھ میں انگریزوں کے خلاف جہاد کی تحریک شروع کی تھی۔ اور سپاہیوں میں پھیل چکی تھی۔ اس کی وجہ سے لکھنؤ اور لکھنؤ کے قید خانے کا نقشہ بدل گیا تھا۔ اور جیل کے سپاہیوں نے مولوی احمد اللہ کو آزاد کر دیا

مولوی احمد اللہ شاہ نے پہلے تو الہ آباد جا کے وہاں بغاوت کی تنظیم کی لیکن ان کے اپنے ساتھیوں نے دغا دی۔ یہ صورت ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں بار بار اور ہر جگہ پیش آئی۔ الہ آباد میں مولوی احمد اللہ شاہ اپنے آپ کو شہنشاہ دہلی بہادر شاہ ظفر کا گورنر سمجھتے تھے۔ الہ آباد کے چھن جانے کے بعد وہ پھر لکھنؤ واپس آئے۔

اس زمانے میں حضرتِ محل لکھنؤ میں فوج کی باقاعدہ تنظیم کر چکی تھیں۔ ان کے حکم کی بنا پر جنرل حسام الدین نے تیرہ پلٹنیں بھرتی کی تھیں۔ میر صفدر علی۔ محمد تقی خاں میر نادر حسین، جواہر علی خاں، ہلال خاں، اعجاز علی خاں، قاسم علی خاں، بہادر مرزا۔ اصغر علی اور محمد حسن خاں ان پلٹنوں کے افسر تھے۔ قصر الخاقان میں مرزا برجیس قدر کا

دربار لگتا - اراکین سلطنت حاضر ہوتے - پردے کے پیچھے حضرتِ محل امورِ سلطنت اور جنگ کے انتظامات کے احکام صادر کرتیں - لکھنؤ بھر میں برجیس تھانہ چوکی بٹھا دیئے گئے - اور مالگذاری کی تحصیل کی جانے لگی -

اب مولوی احمداللہ شاہ واپس گھسیاری منڈی آچکے تھے - ان کے ہزاروں عقیدت مند اُن کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے - آتے ہی نصف لکھنؤ پر ان کا قبضہ ہو گیا انہوں نے اپنی طرف سے تھانہ چوکی مقرر کر دیئے تھے احمداللہ شاہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بانیوں اور منتظموں میں سے تھے - حضرتِ محل نے بڑی دور اندیشی کی - بجائے اس کے کہ وہ اس مردِ درویش کو اپنے دربار میں بلاتیں وہ خود ممّو خاں اور برجیس قدر کو لے کر شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئیں - اور عرض کی کہ میں برجیس قدر کو آپ کی سرپرستی میں پیش کرتی ہوں - حضرت محل نے احمداللہ شاہ کو اپنا مشیرِ خاص مقرر کیا - لیکن جیسا کہ ہماری تاریخ میں بار بار آتا ہے فوراً ہی سازشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ممّو خاں نے شاہ صاحب کے خلاف جال بچھانا شروع کیا -

۳۱ جولائی ۱۸۵۷ء کو مولوی احمداللہ شاہ کی سپہ سالاری میں بیلی گارد پر حملہ ہُوا، یہاں انگریز قلعہ بند ہو کے لڑ رہے تھے - فوج میں اعلان کیا گیا "حضرت محل کے حکم سے لڑنے جاتے ہو - تنخواہ وہی دیں گی - حملے کے دن حضرتِ محل ساری رات انتظامات میں مصروف رہیں اور ایک لمحہ بھی آرام نہ لیا - وہ سپاہیوں کی ہمت بڑھاتیں اور ان کو آرام پہنچانے کی فکر کرتیں - لیکن ممّو خاں نے کمزوری دکھائی - احمداللہ شاہ کا پیر زخمی ہو گیا - لیکن بیلی گارد کا مورچہ فتح ہو گیا -

عالم باغ کے معرکے میں راجہ مان سنگھ نے انگریزوں کو شکست دی - حضرت محل نے اسے خلعتِ رومال اور دو شالہ سے سرفراز کیا اور فرزندِ خاص کا خطاب عنایت کیا

لکھنؤ میں تو حضرتِ محل اور مولوی احمداللہ شاہ کی سرداری میں مجاہدین کو فتح ہو

رہی تھی۔ دہلی پر انگریزوں کا جلد قبضہ ہو گیا۔ اور دہلی کے معرکوں کی روح رواں جنرل بخت خاں لکھنؤ پہنچے۔ فیروز شاہ اور نانا راؤ بھی لکھنؤ آ گئے۔ کیونکہ یہ غدر کے مجاہدین کا آخری مستحکم مرکز رہ گیا تھا۔

مولوی ذکاء اللہ خاں کے الفاظ ہیں۔

"ستر اسی ہزار آدمی بہادری، استقلال اور ہوشیاری سے اپنے مستحکم مقام کو استوار کر رہے تھے جن کو قومی عزت اور مذہبی دیوانگی نے اس جوانمرد عورت حضرت محل نائب السلطنت کے علموں کے نیچے شہر میں جمع کر دیا تھا۔"

بالآخر دہلی کی طرح لکھنؤ میں بھی کمپنی بہادر کے فوجی افسروں نے مجاہدین کی صفوں میں غداری کا جال پھیلایا۔ مہاراجہ بال کرشن جو بظاہر حضرتِ محل کا حامی تھا درپردہ انگریزوں سے جا ملا۔ اس نے حضرتِ محل کو مشورہ دیا کہ تعلقہ داروں کو ان کے تعلقوں پر بھیج دیا جائے تاکہ وہ مزید کمک اور سامانِ رسد لے آئیں۔ حضرتِ محل دھوکہ کھا گئیں اور انہوں نے یہ حکم صادر کر دیا۔ بہت سے تعلقہ دار اپنی اپنی پلٹنوں کے ہمراہ اپنے اپنے تعلقوں کو چلے گئے اور شہر کی فوجی طاقت اور قوتِ مدافعت کمزور پڑ گئی۔

یہاں حضرتِ محل لکھنؤ کی آخری مدافعت کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ وہاں قیدِ فرنگ میں واجد علی شاہ جان عالم اپنی مشہور مثنوی حزنِ اختر لکھ رہے تھے۔ وہ ان واقعات کا قیدیِ فرنگ کے نقطۂ نظر سے ذکر کرتے ہیں:۔

جو وہ چوتھا شہزادہ ہے رشکِ بدر — اسے لوگ کہتے ہیں برجیس قدر
ملا دواں جو حضرت سے نقطِ محل — تو نام اسکی ماں کا کھُلے برمحل
جو بگڑی تھی آگے سے انگریزی فوج — اسے لے گئی جیسے دریا کی موج

وہ اب قبضۂ مفسداں میں ہے آہ | بنایا ہے اپنا اسے بادشاہ

شہر لکھنؤ اب مجاہدین کا آخری مرکز تھا۔ تعلقہ دار رسد لانے جا چکے تھے شہر اندر سے کمزور تھا۔ اندر ہی اندر غداری جڑ پکڑ رہی تھی۔ ممّو خاں احمد اللہ شاہ کے خلاف سازش کر رہا تھا۔

اس حالت میں انگریزوں کو گورکھا سپاہیوں کی مدد مل گئی۔ اور انہوں نے عالم باغ پر حملہ کر دیا۔ حضرت محل کی کوٹھی جو چولکھی کہلاتی تھی نرغے میں آ گئی۔ کمک کے لئے خان علی خاں عین وقت پر پہنچ گئے۔ لیکن صاف معلوم ہوتا تھا کہ بہت جلد انگریز اور گورکھے چولکھی پر قبضہ کر لیں گے۔ ممّو خاں نے مشورہ دیا کہ اب چولکھی کو خالی کر کے لکھنؤ سے چلے جانا چاہیئے۔ حضرت محل کی غیرت اور ہمّت نے یہ قبول نہ کیا بالآخر احمد اللہ شاہ نے انگریزی حملے کا سارا بوجھ اپنے لشکر پہ لے لیا۔ تاکہ حضرت بیگم کو باہر نکل جانے کا موقع مل سکے۔ قیصر التواریخ میں اس دلیر اور جوانمرد عورت کی اس شکست کا حال درج ہے۔ یہ جنگ میں شکست تھی، نسوانی عزم و استقلال کی شکست نہ تھی۔ لکھا ہے کہ حضرت محل بحالِ تباہ مع دیگر بیگمات اور شاگرد پیشہ عورات ملازمین پھاٹک سے نکلیں۔ اس طرح کہ وہ آگے تھیں اور سب پیچھے صف بستہ۔ پیادہ پائی کی وجہ سے ہر ہر قدم پر ٹھوکریں کھاتی اور الجھتی تھیں۔ ٹیلہ شاہ جلیل سے گزر کر پل مولوی گنج پر پہنچیں۔ تلنگے ہر طرف گھوم رہے تھے۔ رات کو غلام رضا کے یہاں قیام کیا۔ پھر وہاں سے شرف الدولہ کے گھر گئیں۔ وہاں سے محل سرائے حسین آباد گئیں۔ شام تک جتنا عملہ شاگرد پیشہ تھا۔ سب جمع ہو گیا اور ان کی حفاظت کو پہرے کھڑے ہوئے علی رضا کے یہاں جنرل اوٹرام کا پیغام پہنچا کہ ہم زمانۂ واجد علی شاہ کا ملک بدستور بحال کر کے آپ کو دے دیں گے۔ جنگ سے دستبردار ہو جایئے۔ فوج مغلوبہ کے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔ حضرت محل نے اوٹرام کی اس پیشکش کو نہایت حقارت

سے ٹھکرا کو صلح نامے پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا۔"

یہ باہمت عورت اگر چاہتی تو اس وقت صلح نامے پر دستخط کر کے اپنی اور اپنے بیٹے کی جان بچا سکتی تھی۔ شاید اودھ کی سلطنت بحال بھی کر دی جاتی لیکن وہ اپنا ملک اپنے حق کے طور پر، تلوار کے زور سے حاصل کرنا چاہتی تھی، خیرات کے طریقے پر نہیں۔

مارچ ۱۸۵۸ء کو حضرتِ محل کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ اس اولوالعزم عورت نے اب بھی ہمت نہیں ہاری، کچھ پرانے جانثار آ ملے، کچھ نئے سپاہی مل گئے۔ جب وہ بٹولی پہنچی ہے تو اس کے پاس چھ ہزار مسلّح فوج تھی۔

اس درمیان میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بانی سید احمد اللہ شاہ کے جہاد اور مقابلہ کا سلسلہ جاری تھا۔ انگریزوں اور گورکھوں کی بڑھتی ہوئی فوجی طاقت اور اپنے افسروں کی غدّاری اور نالائقی کے باوجود انہوں نے ہمت نہ ہاری تھی۔ اب وہ شاہجہان پور کا محاصرہ کر رہے تھے۔ حضرت محل اپنی فوج کے ساتھ ان کی کمک کو جا پہنچیں۔ جب سید احمد اللہ شاہ کو شکست ہوئی تو حضرت محل اور ان کے فرزند نے بدرجۂ مجبوری دریائے گھاگھرا کو پار کر کے نیپال میں پناہ لی اس واقعہ پر تاریخ اودھ میں ایک قطعۂ تاریخ درج ہے جو یہ ہے:۔

مرزا رمضان علیؔ ناکام　　　شد جانبِ کوہ چوں سگ تاز
تاریخ روانگی چو جُستم　　　"نیپال شتافت" آمد آواز

یہ محلوں کی پلی ہوئی ملکہ جس نے لکھنؤ کی نفاست میں آنکھیں کھولی تھیں ساری عمر عیش آرام میں بسر کی تھی۔ نیپال جیسے جاہل اور اجڈ ملک میں پہنچی۔ یہاں ان کے میزبان مہاراجہ نیپال نے چال چل کے ممّو خاں کو گرفتار کرا دیا لیکن حضرت محل اور

شہزادہ برجیس قدر سے کوئی تعرض نہ کیا۔

حضرت محل زندگی کے آخری سال نیپال کے سنگلاخ پہاڑوں میں گزار رہی تھی یہاں برصغیر میں انگریزوں کی حکمتِ عملی بدل چکی تھی۔ کمپنی بہادر کے بجائے اب حکومت ملکۂ معظمہ ان کی پارلیمنٹ اور ان کے وزرا کی نگرانی میں منتقل ہو گئی تھی۔ پہلے تو باغیوں کو عبرت ناک سزائیں دی گئیں۔ اس کے بعد عفو و درگذر کی پالیسی کا آغاز ہوا۔ انگریزوں نے بہت کوشش کی کہ حضرت محل کو واپس بلوالیں۔ ایک انگریز مصوّر کو نیپال برجیس قدر کی تصویر کھینچنے کے لئے بھیجا گیا۔ اس کے ہاتھ حضرت محل کو یہ پیغام بھیجا گیا کہ آپ واپس تشریف لے آئیں۔ لکھنؤ یا فیض آباد جہاں چاہیں قیام فرمائیں۔ تنخواہ کے علاوہ احترامِ شاہانہ کا خاص خیال رکھا جائے گا۔ حضرت محل نے یہ منظور نہ کیا۔ جس ملک کو وہ آزادی دلانا چاہتی تھی، اور جس کی آزادی کے لئے وہ لڑی تھیں اس میں اب غلام بن کے رہنا انہیں منظور نہ تھا۔ اس نے ان ساری تجویزوں کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور اپنی زندگی کے باقی دن نیپال میں گزار دیئے ⁂

قرۃ العین طاہرہ

شاعرہ

انیسویں صدی کے ایران کا تصوّر کیجئے۔ صفوی خاندان کی شان و شوکت کے زوال کے بعد قاچار خاندان کی حکومت کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہ ایران کی تاریخ کا سب سے زیادہ زوال پذیر زمانہ تھا۔ فنونِ لطیفہ کا چراغ بجھ چکا تھا۔ فارسی شاعری جو قسطنطنیہ سے جہانگیر آباد ڈھاکہ تک ہر پڑھے لکھے مسلمان کا ثقافتی ورثہ تھی دم توڑ رہی تھی۔ صرف قاآنی باقی رہ گیا تھا، جس کے الفاظ اور ترکیبوں میں ایسی روانی تھی جیسے صنوبروں کے درمیان آبشار۔ اس زمانے میں ایران کی سب سے بڑی باہنر، باحوصلہ اور صاحب دماغ خاتون پیدا ہوئی۔ یہ خاتون اپنے دوسرے اوصاف کے علاوہ ایران کی پہلی اور واحد عظیم الشان شاعرہ تھی۔ اس کے کلام میں بھی قاآنی کی طرح آبشار کی سی کیفیت ہے۔ لیکن اس میں دبدبہ اور طنطنہ اور جوش و خروش قاآنی سے کہیں زیادہ ہے۔ شاید ایران کے کسی اور شاعر کے کلام میں یہ شوریدگی اور زور نہیں:۔

ہلہ اے گروہِ عمائیاں   بکشید ہلہلۂ ولا
کہ ظہورِ دلبرِ ما عیاں   شدہ فاش وظاہر و برملا
برسید با سپہِ طرب   صنمے عجم صنمے عرب
بدمید شمس زِ ما غرب   بدوید الیہ ظہرِ دلا
فورانِ نار زِ ارضِ فا   دُورانِ نور ز شہرِ طا
ظہرانِ روح ز شطرہا   دلقد علا وقد اعتلا

طیر العماء تکفکت   ورق البھا تصفصفت
دیک الفیاء تذورقت   متجملاً، متجلاً

اور اس آبشار کی روانی محض سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرانے کی آواز نہیں۔ اس میں غضب کا سُریلا پن اور نسوانی نغمگی بھی ہے۔ مثلاً:-

بدیارِ عشق تو ماندہ ام   زِ کسے ندیدہ عنایتے
بغیر مہیم نظرے فگن   تو کہ پادشاہ ولایتے
ننمودہ طاقت و صبر طے   بکشم فراقِ تو تا بکے
ہمہ بند بندِ مرا چو نئے   بُود از غمِ تو حکایتے

بڑے صدمے کی بات یہ ہے کہ اس کے کلام کا بہت کم حصّہ باقی رہ گیا، مشکل سے چار نظمیں بچ سکیں۔ ورنہ اس کی اور بہت سی یادگاروں اور اس کی تصویر کی طرح اس کی شاعرانہ تخلیقیں بھی اس تعصّب اور تنگ نظری کی نذر ہو گئیں جس کا مقابلہ کرنے میں اس نے ساری عمر گذار دی۔

قرۃ العین طاہرہ کا اصلی نام زرّیں تاج تھا۔ ایران میں لڑکیوں کے بڑے خوبصورت نام رکھے جاتے ہیں۔ اس کی تاریخِ پیدائش کے متعلق اختلاف ہے۔ اور مختلف روائتیں ہیں لیکن قرینِ قیاس یہ ہے کہ وہ ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئی۔ اس کا مولد قزوین تھا۔ اس کا خاندان قزوین کے مجتہدین کا ایک بڑا مشہور خاندان تھا جو اپنے تعصّب اور تنگ نظری کی وجہ سے مشہور تھا۔ بہت جلد ناصرالدین شاہ قاچار کے زمانے میں مجتہدین ہی ترقّی اور دیانت کا بہت بڑا سہارا بنے۔ لیکن وہ وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ ابھی تک جمال الدین افغانی کا پیغام ایرانیوں اور ترکوں اور مصریوں نے نہیں سنا تھا۔ اور ایران پر جہالت اور تعصّب کا سایہ تھا۔ ان حالات میں تعجب معلوم ہوتا ہے کہ کیونکر زرّیں تاج کے والد حاجی ملّا صالح نے اس کی تعلیم کی طرف توجہ کی

اس زمانے میں لڑکیوں کو عالمِ اسلام میں تعلیم بالکل نہیں دلائی جاتی تھی۔ بہت کم وہ گھر کی چار دیواری سے باہر قدم نکال سکتیں۔ اور پردے کی بڑی سخت پابندی تھی، معلوم یہ ہوتا ہے کہ زرّیں تاج بچپن ہی سے بہت ذہین تھی۔ اس نے اپنے بھائیوں کے دیکھا دیکھی پڑھنا لکھنا شروع کیا اور بہت جلد ان سے سبقت لے گئی اس کی ذہانت اور اس کے شوق کو دیکھ کر اس کے والد نے اس کی ہمت افزائی کی۔ رفتہ رفتہ وہ علومِ دینیات کی ماہر ہوگئی۔ قرآن اور تفاسیر اسے حفظ تھیں۔ فقہ اور حدیث میں اس نے ایسی دستگاہ حاصل کر لی کہ قزوین کے بہت کم مرد علماء اس کی برابری کا دعوےٰ کر سکتے تھے۔

حاجی ملّا صالح کے دو بھائی اور تھے۔ حاجی مُلّا محمد تقی اور حاجی ملا محمد علی۔ ان میں حاجی ملا محمد تقی خاندان بھر میں سب سے زیادہ متشدّد تھے۔ انہیں کے لڑکے ملّا محمد سے زرّیں تاج کی شادی کر دی گئی۔ شادی کے وقت زرّیں تاج کی عمر صرف تیرہ سال کی تھی۔ لیکن شادی سے زرّیں تاج کے علمی مشاغل میں کوئی ہرج واقع نہیں ہوا۔ وہ اسی انہماک سے علومِ دینیہ کا مطالعہ کرتی رہی۔

جلد ہی اس نے محسوس کیا کہ اس کا رجحان ایسے علماء کی طرف زیادہ ہے جو روایتی تنگ نظری کے مخالف ہیں، اور جو مذہبی خیالات میں انقلاب کے آئینہ دار ہیں۔ ان میں سے خاص طور پر شیخ احمد احسائی اور سید کاظم رشتی کی تصنیفوں کا اس پر بڑا گہرا اثر ہوا۔ مثلاً شیخ احسائی کا روزِ حشر کے متعلق یہ عقیدہ تھا کہ مُردوں کے جسموں میں جو سڑ گل چکے ہیں از سرِ نو جان نہ پڑے گی بلکہ روحیں مواخذے کے لئے بیدار کی جائیں گی۔ زرّیں تاج کے نزدیک یہ اجتہاد تعلیمِ قرآن کے عین مطابق تھا۔

شیخ احسائی اور سید کاظم رشتی دونوں کا عقیدہ مہدیٔ موعود کے متعلق اثنا عشریہ عقیدے سے مختلف تھا۔ وہ امامِ غائب کے بجائے ایسے مہدیٔ موعود کے قائل تھے

جو ماں کے بطن سے پیدا ہو گا۔ اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ مہدی موعود کا ظہور عنقریب ہونے ہی والا تھا۔ اس لحاظ سے شیخ احسائی اور سید کاظم رشتی کو بہائی فرقہ کے لوگ باب کا پیشرو سمجھتے ہیں۔ بہرحال زرّیں تاج اس عقیدے سے اس قدر متاثر ہوئی کہ اس نے سید کاظم رشتی سے خطوط کے ذریعے سلسلہ تلمّذ شروع کیا۔ اور سید کاظم رشتی ہی نے زرّیں تاج کو قرۃ العین کا لقب عطا کیا۔ اس کے نام کے مقابلے میں یہ لقب زیادہ مشہور ہے۔

اس نے اپنے والد اور اپنے چچا کو اپنا ہم خیال بنانے کی بہت کوشش کی مگر اس کے بزرگ مجتہدین اس کے خیالات کو بدعت سمجھتے۔ بالآخر اس نے بمشکل حرمین شریفین کی زیارت کی اجازت لی۔ زیارت کے علاوہ اس کی پوشیدہ خواہش یہ بھی تھی کہ وہ سیّد کاظم رشتی سے درس حاصل کر سکے۔ لیکن اس کے کربلا پہنچنے سے دس روز قبل سید کاظم رشتی کا انتقال ہو گیا۔ یہ ۱۸۴۳ء کا ذکر ہے۔ سید کاظم کے اہلِ خاندان نے اس کی اس لحاظ سے مدد کی کہ بہت سی کتابیں اور مسودے جو سید کاظم رشتی نے لکھے تھے اسے مطالعے کے لئے دیئے۔ وہ تین سال تک کربلا میں مقیم رہی اور یہیں اس نے رفتہ رفتہ بابی مذہب اختیار کیا۔ وہ بڑے جوش اور ولولے سے باب کے ظہور کا ذکر کرتی :-

طلعات قدس بشارتے کہ جمالِ حق شدہ برملا
بزن اے صبا تو بہ ساحتش بگروہِ غمزدگاں صلا
ہلہ اے طوائفِ منتظر، زعنایت شہِ مقتدر
مہِ مستتر شدہ مشتہر، متبہیاً متجلّلاً
شدہ طلعتِ صمدی عیاں کہ بپا کند علمِ بیاں
زگمان و وہمِ جہانیاں، بجبروتِ اقدس او علا

بہت جلد اس نے اپنے استادِ روحانی سید کاظم رشتی کی جگہ خود درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ وہ خود پردے کی اوٹ میں بیٹھتی اور درس دیتی۔ اسی زمانے میں اس کے چھوٹے چچا مرزا محمد علی بھی باب کے معتقد ہو گئے۔ اور انہوں نے باب سے قرۃ العین کا ذکر کیا۔ اور اس کا دوسرا لقب "طاہرہ" باب کا عنایت کیا ہوا ہے قرۃ العین اس کو تخلص کے طور پر استعمال کرنے لگی۔

اسی زمانے میں نجف اشرف اور کربلائے معلّی کے مجتہدین و علماء نے عراق کے ترک گورنر سے طاہرہ کی لادینی اور ارتداد کی شکایت کی۔ قرۃ العین کو کربلائے معلّی چھوڑ کر بغداد آنا پڑا یہاں وہ نظر بند رہی اور اس کا مقدمہ بابِ عالی قسطنطنیہ میں سلطان المعظم کے پاس پیش ہوا۔ ایران کی طرح ترکوں کی سلطنتِ عثمانیہ بھی بابیوں کو اگر مرتد نہیں تو ملحد ضرور سمجھتی تھی۔ اور اس کو اپنی سرحدوں سے دور رکھنا چاہتی تھی اس لئے قرۃ العین طاہرہ کو سلطان کے حکم سے آزادی تو دے دی گئی لیکن ساتھ ہی ساتھ حکم دیا گیا کہ وہ سلطنتِ عثمانیہ کے حدود سے باہر چلی جائے۔ اسے مجبوراً اپنے وطن ایران واپس آنا پڑا۔ راستے ہی میں قرۃ العین طاہرہ نے بڑے جوش و خروش سے درس و تدریس اور وعظ کا سلسلہ شروع کیا۔ جس میں وہ بابی مذہب کی تلقین کرتی کرمان شاہ میں اس کی ایک تقریر پر ایک مجمع مشتعل ہو گیا۔ لیکن وہ اپنی دُھن کی پکّی تھی۔ بالآخر اس کے والد نے اسے قزوین واپس بلا لیا۔

یہاں اس کی اور اس کے شوہر کی قطعی علحدگی ہو گئی۔ وہ اپنے شوہر کو متعصّب اور کٹھ مُلا سمجھتی تھی۔ وہ اس کو مُلحد اور بے دین سمجھتا تھا۔ فیصلہ یہ ہُوا کہ وہ اپنے والد کے گھر رہنے لگی۔ اسی زمانے میں بدقسمتی سے ایک بابی مُلا عبداللہ صالح شیرازی نے اس کے چچا اور خسر مُلا تقی کو قتل کر ڈالا۔ اس کے شوہر مُلا محمد نے مقدمہ دائر کیا کہ یہ قتل قرۃ العین کے ایما سے ہوا ہے وہ کشاں کشاں زندان پہنچی لیکن اصل مجرم نے فوراً

اقبالِ جرم کرلیا۔ اس کے والد اسے اپنے گھر لے آئے اور یہاں بہت سخت پابندی میں رکھا۔ لیکن اسے تو اپنے نئے مذہبی پیشوا باب تک پہنچنے اور اس نئے مذہب کی تبلیغ کرنے کی دُھن تھی۔ اپنے اس جذبۂ عقیدت کا وہ بڑے سوز و گداز سے اپنے کلام میں اظہار کرتی ہے۔ قدرت کا منشا یہ تھا کہ اسے باب سے ملنا کبھی نصیب نہ ہُوا اور اپنے روحانی پیشوا کے دیدار کو ترستی رہی۔ لیکن اس حسرت دیدار میں ایسا روحانی عشق ہے جو فارسی شاعری میں کم کہیں ملے گا۔

گر بہ تو افتدم نظر، چہرہ بہ چہرہ رُو بہ رُو
شرح دہم غم ترا، نکتہ بہ نکتہ مُو بہ مُو
از پئے دیدنِ رُخت، ہم چو صبا افتادہ ام
خانہ بخانہ در بدر، کوچہ بکوچہ کُو بہ کُو
میرود از فراقِ تو خونِ دل از دو دیدہ ام
دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم چشمہ بہ چشمہ جُو بہ جُو
مہرِ ترا دلِ حزیں، بافتہ بر قماشِ جاں
رشتہ بہ رشتہ، نخ بہ نخ تار بہ تار و پُو بہ پُو
در دلِ خویش طاہرہ گشت و ندید جُز ترا
صفحہ بہ صفحہ لا بہ لا، پردہ بہ پردہ تُو بہ تُو

غرض عقیدت کی یہی لگن اسے اپنے گھر کی اس قید سے چھڑا لے گئی۔ وہ کسی نہ کسی طرح طہران پہنچی۔ اور بہاء اللہ کے یہاں مہمان ٹھہری۔ اپنے روحانی پیشوا باب سے ملنے کی اسے جو تمنّا تھی وہ دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ بہاء اللہ نے بھی اسے بتایا کہ یہ ناممکن ہے یہاں اس نے مناظروں میں حصہ لینا شروع کیا۔ بڑے بڑے علماء اور مجتہدین اس کے علم کی وجہ سے اس کا مقابلہ کامیابی سے نہ

کر سکے۔ اس نے درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کیا۔

اس کا شوہر ملّا محمد تو اس کا دشمن تھا ہی۔ تنگ نظری نے طہران بھر کے علماء کو اس کا دشمن بنا دیا۔ ہم نے اب تک اس امر کا ذکر نہیں کیا ہے۔ لیکن اس کے متعلق ہر ایک کی رائے یہ تھی کہ وہ حد درجہ حسین تھی۔ اس کے دشمنوں نے مشہور کیا کہ جب وہ مناظرے میں ہارنے لگتی ہے تو اپنے چہرے سے نقاب الٹ دیتی ہے۔ اور اس کا حریف اس کے حُسن سے اتنا مسحور ہو جاتا ہے کہ بحث کرنا بھول جاتا ہے یہ تو مبالغہ ہے لیکن اس کے حسن کا بھی اس کی قابلیت اور اس کے الحاد کے برابر برابر چرچا تھا۔

۱۸۴۹ء میں اس کی ملاقات محمد علی بارفروشی سے ہوئی جس کو بہائی فرقے کے لوگ قدوس کہتے ہیں۔ لیکن جس کو ایرانی مورخین عام طور پر باغی اور ڈاکو قرار دیتے ہیں۔ محمد علی بارفروشی اور قرۃ العین طاہرہ کے عشق کے واقعات کا ذکر "آئینہ تلبیس" کے مصنّف نے کیا ہے۔ بہائی مورخین ان دونوں کے باہمی مراسم کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ ان حالات میں کہ مورخین کا ایک گروہ عقیدت، اور دوسرا گروہ تعصّب کے جوش میں مبالغے کرتا ہے۔ صحیح حالات و واقعات کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر قرۃ العین طاہرہ کو کسی مرد سے کبھی محبّت ہوئی تو صرف محمد علی بارفروشی سے۔ اور اگر یہ واقعہ غلط ہے تو پھر اصلیت محض اس قدر ہے کہ وہ محض اپنے نئے مذہب اور اس کے بانی سے روحانی عشق میں مبتلا رہی اور اس کے دامن پر کوئی داغ نہیں۔ جہاں تک اس کی چار پچی کھچی نظموں سے پتا چلتا ہے اس کے کلام میں کسی طرح کے مجازی عشق کو دخل نہیں۔ جہاں وہ عشق کا ذکر کرتی ہے یا اپنی عشقیہ حالت بیان کرتی ہے تو یہ وجد اور عرفان کی حالت ہے۔ اور اس سے تو اس کی پاک دامنی اور عصمت کا اور یقین ہو جاتا ہے۔

قصہ مختصر جب شاہ ایران کی فوجوں نے ۱۸۴۹ء میں طبرسی کا قلعہ فتح کیا اور محمد علی بارفروشی کو گرفتار کر لیا تو قرۃ العین طاہرہ بھی گرفتار کر لی گئی۔ طہران لائی گئی اور ناصر الدین شاہ قاچار کے حضور میں پیش کی گئی۔

ناصر الدین شاہ قاچار کا زمانہ ایران کی تاریخ میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو محمد شاہ رنگیلے کا زمانہ دہلی میں یا نصیر الدین حیدر کا زمانہ اودھ میں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایران کی آزادی ختم کے قریب ہے اور رات ایسی تاریک ہے کہ اب کبھی صبح نہ ہوگی۔ اس زمانے کے حالات کو ایک امریکن مسٹر مورگن شسٹر نے بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ جو اس دیوالیہ ملک کی مالی حالت درست کرنے کے لئے ملازم رکھا گیا تھا۔ اگر ایران زندہ رہ گیا تو صرف روس اور برطانیہ کی باہمی رقابت کی وجہ سے جو افغانستان کی طرح ایران کو بھی دونوں شہنشاہیوں کے درمیان ایک کمزور اور بیجان ملک کی حیثیت سے باقی رکھنا چاہتے تھے۔ اگر بہائی اور بابی تحریک کا معاشی تجزیہ کیا جائے تو غالباً یہ اس جمود کے خلاف مذہبی سطح پر ایک بغاوت تھی۔ سیاسی سطح پر علماء و مجتہدین نے ناصر الدین شاہ قاچار کی ملک فروشی کے خلاف تحریکیں شروع کیں اور سب سے بڑھ کر سید جمال الدین افغانی نے جو کچھ عرصہ تک ناصر الدین قاچار کے وزیر بھی رہے دیگر اسلامی ممالک کی طرح ایران میں بھی جمہوری اور عوامی شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔

بہرحال ناصر الدین شاہ قاچار کے دربار اور ملک کا یہ ماحول تھا جس میں ایک غدار اور باغی ملحدہ اور کافرہ کی حیثیت سے قرۃ العین طاہرہ ایران کے شہنشاہ کے حضور میں پیش کی گئی۔

ناصر الدین شاہ قاچار پہلے اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر مبہوت سا ہو گیا۔ اور پھر اس کی ذہانت، اس کی شاعری اور اس کے خلوص سے مسحور ہو گیا۔ اسے

کلاں تر کے یہاں نظر بند رکھا گیا۔ وہ نظر بند کیا تھی مہمان تھی۔ عام طور پر مشہور ہے کہ ناصر الدین شاہ قاچار نے اسے ایک خط لکھا جس میں اس سے درخواست کی کہ اگر وہ بابی مذہب چھوڑ دے، اور پھر سے مومنہ بن جائے اور اثنا عشری عقائد کی تہ دل سے پابندی کرے تو شہنشاہ اسے اپنے حرم میں اولین درجہ عطا کر کے اسے اپنی ملکہ بنائے گا۔ اس کے جواب میں اسی خط کے حاشیے پر قرۃ العین طاہرہ نے اپنا ایک مشہور شعر لکھ بھیجا جو اس نے فرطِ عقیدت میں انکسار کے عالم میں محمد علی باب سے خطاب کر کے لکھا تھا لیکن جو ناصر الدین شاہ قاچار کے پیامِ نسبت پر چسپاں ہو گیا۔

وہ شعر یہ تھا ؎

تو و ملک و جاہِ سکندری، من و رسم و راہِ قلندری
اگر آں خوش است تو درخوری، وگر ایں بدست مرا سزا

اس پر بھی ناصر الدین شاہ قاچار اس کے قتل کا حکم نہ دے سکا۔ کلاں تر کے محل میں امرائے دربار کی خانمیں، اور شہزادیاں اس کے گرد جمع ہوتیں۔ اس کا کلام سُنتیں۔ یہاں تک کہ وہ جب ان خواتین کے سامنے باب کی فضیلتیں بیان کرنی شروع کرتی تو وہ اس کی زبانی یہ بھی خاموشی سے سن لیتیں۔ معلوم نہیں اس ڈرامے کا آخری سین کیا منظر دکھاتا ۔ ممکن ہے کہ نور جہاں کی طرح وہ بھی بالآخر ناصر الدین شاہ قاچار سے شادی کرنے پر ہامی بھر لیتی اور اس طرح ایران کی تاریخ بدل جاتی لیکن اس کا دل دوسری طرح کی عقیدت سے بھرپور تھا۔ اس کی قسمت شاعرہ کی تھی ملکہ کی نہ تھی۔

ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اس کا، اس کی زندگی، اس کی شاعری کا یک لخت خاتمہ کر ڈالا۔ اگست ۱۸۵۲ء میں بعض احمق بابیوں نے ناصر الدین شاہ قاچار کو قتل کرنے کے لئے گولیاں چلائیں۔ اس واقعہ سے سارا ایران جو ناصر الدین شاہ قاچار

کی جان کو اس قدر عزیز نہ سمجھتا تھا لیکن بابیوں کو سخت ناپسند کرتا بھڑک اٹھا۔ بابیوں کا قتل عام شروع ہو گیا اور اسی ہنگامے میں ستمبر ۱۸۵۲ء کو قرۃ العین طاہرہ قتل کر دی گئی۔

قرۃ العین طاہرہ کے قتل کا واقعہ بہت اختلاف سے بیان کیا جاتا ہے بعض مورخین کا خیال ہے کہ اسے ناصر الدین شاہ قاچار کے حکم کے بغیر چپکے سے گلا گھونٹ کے ہلاک کر دیا گیا۔ ایک اور روایت یہ ہے کہ جب بابیوں کا قتل عام ہونے لگا تو وہ سمجھ گئی کہ اب اس کا بھی زندہ بچنا مشکل ہے اس نے عرق گلاب سے غسل کیا۔ زلفوں میں پھول سجائے، آنکھوں میں سرمہ لگایا اور دلہنوں کی طرح موت کا استقبال کرنے کے لئے تیار ہوئی۔ اس کے حسن میں اس غضب کا اثر تھا کہ کوئی جلاد اسے قتل کرنے پر تیار نہ ہوتا تھا۔ ایک نشے میں چور حبشی نے اس کی گردن میں ریشم کا پھندا ڈال کے اسے ہلاک کر ڈالا۔ ایک اور روایت جو "آئمہ تلبیس" میں نقل کی گئی ہے زیادہ ہولناک ہے اور ممکن ہے یہی اصلیت سے زیادہ قریب ہو۔ ناصر الدین قاچار پہلے ہی سے خار کھائے بیٹھا تھا کہ قرۃ العین طاہرہ نے اس کی ملکہ بننے سے انکار کر کے نہ صرف اس کی محبت کو ٹھکرا دیا تھا، اس کی نخوت کو بھی شکست دی تھی۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ یورپ کے سفرا نے جو ایران میں مقیم تھے یہ عرض کی کہ بابی ملزمین کو ایذا دیئے بغیر قتل کیا جائے۔ شاہ نے جہاں ہر ایک کو عبرت ناک سزا دی، وہاں قرۃ العین کے لئے یہ سزا تجویز کی گئی کہ اس کے خوب صورت لمبے لمبے سنہرے بال جو اس کے زانوؤں تک پہنچتے تھے، ایک گدھے کی دُم میں باندھ دیئے گئے اور گدھے کو مار مار کے طہران کی سڑکوں پر دوڑایا گیا۔ اس طرح اس عجیب و غریب عورت کی دردناک موت واقع ہوئی۔

عجم کی ساری تاریخ میں قرۃ العین طاہرہ کی نظیر نہیں ملتی - اس کی عجیب وغریب شخصیت بجائے خود ایک معجزہ ہے - وہ ایک ایسے معاشرے میں پیدا ہوئی جہاں عورت کو تعلیم ملنا تو درکنار اس کی آواز تک نامحرموں کے کانوں میں نہ پہنچنے دی جاتی تھی - اس نے اپنے ذوق وشوق سے نہ صرف تعلیم حاصل کی بلکہ علوم دینی میں ایسی دستگاہ حاصل کی جو مردوں کے لیئے قابلِ رشک تھی - اس نے ایک نئی مذہبی تحریک میں نمایاں حصّہ لیا - جو راستہ اس نے اختیار کیا اسے دوسرے فرقوں اور مذاہب کے لوگ صحیح سمجھیں یا غلط اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جس قابلیت جرأت، جوشِ کردار، آزادیٔ گفتار کا مظاہرہ اس نے کیا، اس دنیا میں بہت کم عورتیں ان حالات میں ان صفات کا اظہار کر سکتیں - وہ خود صحیح راستہ پر ہو یا غلط راستہ پر، اس نے جس بات کو حق سمجھا اس کا اعلان کیا - جس بات کو باطل سمجھا اسے مٹانے کی کوشش کی - اس کی مذہبی تبلیغ سے قطع نظر تاریخ انقلابِ ایران میں اس کی شخصیت نے جو کام کیا وہ کبھی بھلایا نہیں جائے گا - اس نے آزادیِ رائے کے اس اہم اور جرأت آموز اصول پر سختی اور ہمت سے عمل کیا جس کے بغیر جمہور کا شعور بیدار نہیں ہو سکتا - اس نے اپنے آپ کو دولت کے ہاتھ نہیں بیچا - اس نے کہنہ روایات کا مقابلہ کیا - اور اس مقابلے میں کام آگئی - ان روایات میں بہت سی قابل تحفّظ قدریں ضرور تھیں - لیکن جب ان روایات پر پہلا حملہ ہوتا ہے تو یہ اپنی مدافعت کے لیئے اپنی صفات اور اپنی خوبیوں کو نہیں بلکہ تعصّبات کو استعمال کرتی ہیں - ان تعصّبات کی اس نے کوئی پروا نہ کی -

اس کی شاعری اور بھی زیادہ قابلِ تحسین ہے - اگرچہ یہ سعادت خدائے بخشندہ کی بخشش ہوتی ہے - لیکن اس کی شاعری بڑی حد تک اس کی شخصیت کی آئینہ دار ہے - تخیل سے زیادہ اس میں جوش وخروش اور ولولہ ہے - الفاظ کی بندش اور ترکیبوں

میں زلزلے کا سا ہیجان ہے۔ وہ قرآن مجید کی عالم اور حافظ تھی اور اپنے کلام میں عربی ترکیبیں اور فقرے برجستہ اور بے تکلفی سے استعمال کرتی ہے۔ اس کی آورد میں بھی ایک آمد ہے۔ ایک بڑی خصوصیت اس کی شاعری میں یہ ہے کہ یہ داد اور تحسین حاصل کرنے کے لئے نہیں لکھی گئی۔ اس لئے اس میں صنائع و بدائع کی طرف کوئی توجہ نہیں۔ الفاظ خلوص دل سے نغمہ اور شعر بنتے چلے جاتے ہیں۔ اور اسی لئے ان میں بلا کا اثر ہے۔ جب تک فارسی زبان زندہ ہے۔ اس کے کلام کی وجہ سے اس کا نام زندہ رہے گا۔ اور اسی وجہ سے لوگ اس کی شخصیت میں دلچسپی لیتے رہیں گے اور اس کی زندگی کی کہانی بار بار سنیں گے۔

خالدہ خانم ادیب

شاعرہ، ادیبہ اور مجاہدہ

سنہ ۱۸۸۴ء تا سنہ

ترکوں کی تازہ تاریخ میں جس طرح انور پاشا۔ طلعت پاشا۔ جمال پاشا اور مصطفےٰ کمال پاشا کے نام آفتاب و مہتاب بن کر چمک رہے ہیں اسی طرح خواتین میں خالدہ خانم ادیب کا نام بھی اپنی درخشانی کے اعتبار سے نظیر نہیں رکھتا۔

عثمان ادیب پاشا سلطان عبدالحمید خاں کے وزیر خزانہ تھے آپ کی تین بیویاں تھیں۔ ان سے تین ہی لڑکیاں پیدا ہوئیں جن کے نام خالدہ خانم، نگار خانم اور بلقیس خانم تھے۔ عثمان ادیب پاشا نہایت روشن خیال اور دانشمند آدمی تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنی لڑکیوں کو جدید تعلیم سے بہرہ ور کرنے کے لئے انہیں قسطنطنیہ کے رابرٹس کالج میں داخل کر دیا۔ حالانکہ اس زمانے میں ترکی قوم مغربی تعلیم سے عام طور پر نفور تھی۔

خالدہ خانم سنہ ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئیں۔ سنہ ۱۸۸۹ء میں تعلیم کا آغاز کیا اور ابتدائی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کالج میں سنہ ۱۹۰۱ء میں بی اے کا امتحان نہایت امتیاز سے پاس کیا۔ اس زمانے میں کالج کے ایک پروفیسر احمد صالح بے ریاضیات کے ماہر ہونے کے علاوہ بہت اچھے صحافی بھی تھے۔ اور ان کے علمی۔ ادبی، اور سیاسی مقالات کا بہت شہرہ تھا۔ انہیں خالدہ خانم کی ذہانت، وقابلیت نے گرویدہ کر لیا۔ چنانچہ خالدہ خانم بی اے پاس کرنے کے بعد احمد صالح ہی سے بیاہی گئیں۔ دو تین بچے بھی پیدا ہوئے لیکن اس عرصے میں صالح بے نے دوسری شادی کر لی۔ خالدہ خانم جیسی روشن خیال خاتون

اس حرکت کو کیونکر گوارا کر سکتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے صالح بے سے خلع حاصل کر لیا اور ترکی کی شاہی فوج کے ایک ڈاکٹر خالد بے سے شادی کر لی۔ کچھ عرصے کے بعد خالد بے کا انتقال ہو گیا۔

خالدہ خانم کو مضمون نگاری اور تصنیف و تالیف کا شوق زمانۂ طالب علمی ہی سے تھا۔ اور وہ اپنی تحریروں کی وجہ سے ترکی کے نسوانی حلقوں میں خاصی شہرت حاصل کر چکی تھیں۔ سولہ سال کی عمر میں انہوں نے "ترکی پردے" پر ایک نہایت اچھی کتاب لکھی اور بعد میں فسانہ نگاری شروع کر دی۔ ان کے اسلوب بیان میں ایسی ندرت اور تازگی تھی کہ وہ بہت جلد ترکی فسانہ نگاروں کی صفِ اوّل میں جگہ حاصل کر گئیں۔ "معبدلر" (ویران صنمخانے) اور "سویہ طالب" دو مجموعے بہت مشہور ہوئے۔ جب یہ فسانے یورپ اور امریکہ میں پہنچے تو ان کی بے حد قدر کی گئی۔ اور روسی، جرمن، فرانسیسی، انگریزی اور عربی میں ان کے ترجمے شائع ہوئے۔ خالدہ خانم نے شعر و شاعری کی طرف بھی توجہ کی۔ اور بہت قلیل عرصے میں اس میں بھی ماہر فن کی حیثیت حاصل کر لی۔

اگرچہ اب تک خالدہ خانم انہی علمی ادبی مشاغل میں مصروف تھیں۔ لیکن حقیقت میں ان کا رجحان طبع زیادہ تر اصلاح و ترقی اور سیاسیات کی طرف تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ ترکی عورتوں میں جدید خیالات کو فروغ ہو۔ اور معاشرت و تمدن سے کہنگی اور قدامت کے اثرات دور کئے جائیں۔ آپ نے ملک میں چھوٹی چھوٹی نسوانی انجمنیں قائم کیں۔ اور وزارت تعلیم پر زور دیا کہ ترکی عورتوں کو جدید تعلیم حاصل کرنے میں سہولتیں بہم پہنچائے، ان اصلاحی اور تعلیمی سرگرمیوں سے خالدہ خانم ترکی حلقوں میں ایک باوقار لیڈر تسلیم کی گئیں۔ اور ترکوں کا ہر حلقہ ان کا احترام کرنے لگا۔

جب عہدِ دستوری کا آغاز ہوا اور سلطان عبدالحمید خاں معزول کر دیئے گئے تو "نوجوانانِ ترکی" اپنے ملک کو جدید ترقیات سے بہرہ ور کرنے میں مصروف ہو گئے۔

خالدہ خانم بھی اپنی عدیم المثال تقریر و تحریر سے کام لے کر نسوانی تحریک میں سرگرم ہو گئیں۔ دستور پسند جماعت کے راہنماؤں میں اکثر خالدہ خانم کے ہمزبان ہو گئے۔ ترکی کے طبقہ اعلیٰ کی خواتین بھی خالدہ خانم کی شریکِ عمل ہو گئیں۔ اور حقوقِ نسوانی کی ایجی ٹیشن نے وہ زور پکڑا کہ مدبرین ترکی مطالبات نسواں کے حامی ہو گئے اور حکومت کے دستور میں ان مطالبات کی تکمیل کا بندوبست کر دیا گیا۔ اس زمانے میں خالدہ خانم نے ترکی اخباروں میں بے شمار مضامین لکھے جو ہمیشہ قدر و قیمت سے پڑھے گئے۔ اور ان کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس کے علاوہ خالدہ خانم نے ترکی کی دستور پسند جماعت کی حمایت میں یورپ اور امریکہ کے اخبارات میں مقالات لکھے۔ امریکہ کے اخباروں نے بالخصوص ان کو نہایت فخر سے شائع کیا۔ اور لکھا کہ یہ ہمارے ہی کالج کی ایک پرانی متعلّمہ ہیں۔ جنہوں نے اپنے ملک میں لیڈری کا رتبہ حاصل کر لیا ہے۔

انور پاشا اور طلعت پاشا نے فوراً محسوس کیا کہ خالدہ خانم کو اصلاح و تعمیر قوم کے کام میں شامل کر لینا فی الجملہ ترکی کے لئے مفید ہو گا۔ چنانچہ ان کی استدعا پر خالدہ خانم اہم ترین سیاسی آئین و ضوابط کی ترتیب میں مصروف ہو گئیں۔ جب مدبّرین کو بعض دوسرے مسائل سے کسی قدر فرصت ملی تو شام کے گورنر جنرل جمال پاشا نے ترکی وزارت سے استدعا کی کہ انہیں شام میں تعلیم، صنعت و تجارت اور زراعت کے فروغ کے لئے خالدہ خانم کی خدمات مطلوب ہیں۔ یہ استدعا قبول ہوئی۔ اور خالدہ خانم شام میں وزیر تعلیمات مقرر کی گئیں۔ خالدہ خانم نے وزارت پر فائز ہوتے ہی تعلیمی و صنعتی وسائل بہم پہنچانے کے لئے ایک لائحہ عمل مرتب کیا۔ اور ابتدائی مدارس اور ہائی سکولوں کا جال بچھا دیا۔ یتیم خانے قائم کئے۔ مذہبی تبلیغ کا بندوبست کیا۔ ارمن اور کرد بچوں کی تعلیم پر خاص توجہ کی۔ جمال پاشا کو ان کی فراست اور دانشمندی پر بڑا اعتماد تھا۔ اور وہ اہم ترین سیاسی معاملات میں بھی ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔

ابھی وہ شام ہی میں تھیں۔ کہ پہلی جنگِ عظیم کے شعلے بھڑکنے لگے اور ترکی حکومت کے لئے طرح طرح کی مشکلات پیدا ہو گئیں۔ اس وقت خالدہ خانم شام کو چھوڑ کر قسطنطنیہ چلی گئیں۔ اب وہ ایک طرف ترکی طاقت میں اضافہ کرنے کے لئے وزارتِ جنگ کی امداد میں مصروف ہوئیں اور دوسری طرف انہوں نے امریکہ کے اخباروں میں مسلسل مضامین لکھ کر وہ تمام مجبوریاں بیان کیں۔ جن کے باعث ترکوں کو جنگ عظیم میں کُودنا پڑا۔ "نیو یارک ٹائمز" ہمیشہ نہایت قدر و وقعت سے ان کے مضامین شائع کرتا رہا، اسی زمانے میں خالدہ خانم نے "پان تورانی ززم" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں ترکوں کو یہ بتایا کہ تمہاری قوم ترکی سے لے کر ہرات تک آباد ہے۔ اور ایشیا میں تمہارا مقام نہایت قوی اور فیصلہ کن ہے۔ اس کتاب میں ترکوں کے قومی جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لئے ایسا اندازِ بیان اختیار کیا گیا کہ کوئی ترک اس کے مطالعے کے بعد شجاعت و مردانگی کے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکتا تھا۔ چنانچہ وزارتِ جنگ نے اس کتاب کے ہزاروں نسخے فوج میں تقسیم کرائے۔

جنگ کے زمانے میں خالدہ خانم اکثر اوقات ترکی یتیموں اور بیواؤں کی تالیفِ قلوب کے لئے قسطنطنیہ کی سراؤں اور مسجدوں میں جایا کرتی تھیں اور ان کی امداد و اعانت کے علاوہ ان کی حوصلہ افزائی کیا کرتی تھیں۔

۱۹۱۷ء میں خالدہ خانم نے ڈاکٹر عدنان بے سے شادی کر لی۔ یہ ایک نہایت غیور اور قوم پرست لیڈر تھے۔ "انجمن اتحاد و ترقی" کے ممتاز ممبر اور بے حد محترم رہنما سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ جب بعد میں وہ انقرہ پہنچے ہیں تو وہاں مدّت تک لارڈ چیف جسٹس کے عہدے پر کام کرتے رہے اور پھر دولتِ انقرہ کی طرف سے قسطنطنیہ کے گورنر جنرل مقرر کر کے بھیجے گئے۔ خالدہ خانم اور عدنان بے کا ازدواج پورے ترکی میں پسند کیا گیا کیونکہ اس سے دو ہم مرتبہ رہنمایانِ حرّیت جمع ہو گئے تھے۔

جب جنگِ عظیم اوّل ختم ہوئی تو ترکوں پر مصائب و آلام کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ۱۹۱۸ء میں فرانس، برطانیہ، اٹلی، جاپان اور امریکہ کے جنگی جہاز درہ دانیال میں داخل ہو گئے۔ قسطنطنیہ پر مخالف فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس زمانے کے ہولناک حالات تاریخوں میں درج ہیں، آخر مصطفےٰ کمال پاشا کی شمشیرِ خارا شگاف نے ترکوں کی زنجیریں کاٹ دیں۔ لیکن اس دوران میں قسطنطنیہ میں قوم پروروں پر بڑی مصیبتیں آئیں۔ خالدہ خانم بھی وہیں تھیں لیکن انہوں نے ترکوں کے حقوقِ شاہی کی حفاظت اور ملک کی آزادی کے متعلق آتشبار تقریریں شروع کیں۔ اور جب مئی ۱۹۱۹ء میں یونانیوں نے سمرنا میں ترکوں پر ناقابلِ برداشت مظالم توڑنے شروع کئے تو اس غیور و شجاع خاتون کی سرگرمیاں نہایت وسیع ہو گئیں۔ لاکھوں ترک خالدہ خانم کے جلسوں میں شامل ہوتے تھے۔ اور ان کے پُرجوش نعروں سے سارا ملک گونج رہا تھا۔ قسطنطنیہ کی ۹۵ فی صد عورتیں خالدہ خانم کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ ہو گئیں۔ اور پورے ملک کے حالات اتحادیوں کے لئے خطرناک ہو گئے، وزیرِ اعظم داماد فرید پاشا اتحادیوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن رہا تھا۔ آخر تنگ آ کر اس نے خالدہ خانم کی گرفتاری کے احکام صادر کر دیئے۔

اس موقع پر اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ خالدہ خانم قسطنطنیہ سے بھاگ کر انقرہ پہنچ جائیں۔ چنانچہ خالدہ خانم اور ڈاکٹر عدنان بے دونوں سب سے پہلے خالدہ خانم کے پرانے امریکن مدرسے یعنی رابرٹس کالج میں پناہ گزین ہوئے اور وہاں سے رات کی تاریکی میں کسی نہ کسی طرح باسفورس کو عبور کیا۔ حالانکہ اتحادیوں کے جنگی جہاز اپنی آتش فشاں توپوں سے مسلّح موجود تھے۔ عبور کے بعد خچّر پر سوار ہو کر اناطولیا کے جنگلوں سے ہوتی ہوئی یہ بہادر خاتون انقرہ پہنچ گئیں۔

انقرہ میں مصطفےٰ کمال پاشا رات دن دفاع کے فرض میں منہمک تھے خالدہ خانم کے پہنچ جانے سے انہیں اطمینان ہوا کہ ملک کی داخلی اصلاح و ترتیب کے کام میں

وہ بہت بڑی معاون و مددگار ثابت ہوں گی۔ چنانچہ پہلے تو خالدہ خانم پارلیمنٹ کی ممبر بنیں۔ اور اس کے بعد ۱۹۲۰ء میں جب حکومت نئے سرے سے مرتب کی گئی تو خالدہ خانم دولت ترکیہ کی وزیر تعلیمات مقرر ہو گئیں۔ اور دنیا بھر میں دھوم مچ گئی کہ ترکوں نے سب سے پہلے ایک خاتون کو اپنے کابینہ وزارت میں شامل کیا ہے۔

اگرچہ مصطفےٰ کمال کی پارلیمنٹ میں بعض ایسے معزز حضرات بھی شامل تھے، جو خالدہ خانم کی تعلیمی سکیموں کو فی الحال ملتوی کر دینا چاہتے تھے۔ لیکن جب خالدہ خانم نے اپنی سکیم کے حق میں نہایت مدلل اور مفصل تقریر کی اور پارلیمنٹ کے صدر ڈاکٹر عدنان بے نے رائیں شمار کیں تو ۷۴ ووٹ خالدہ کے حق میں اور صرف تین خلاف تھے۔ اس کے بعد پورے اناطولیا کے گوشے گوشے میں صدہا ابتدائی اور ثانوی مدارس کھول دیئے گئے اور تعلیمی لائحہ عمل پر پورے زور شور سے عمل ہونے لگا۔

اس تعلیمی لائحہ عمل کی تکمیل کے لئے بے شمار پروفیسروں، معلموں اور استانیوں کی ضرورت تھی۔ مدارس کے لئے عمارتیں مطلوب تھیں۔ اور بے شمار روپیہ درکار تھا۔ جو اس جنگ و پیکار کے زمانے میں مہیا کرنا بے حد مشکل تھا۔ لیکن خالدہ خانم نے ان تمام مشکلات پر قابو پا لیا۔ بے شمار پڑھے لکھے مردوں اور عورتوں کو تدریس کی ابتدائی ٹریننگ دے کر سکولوں میں مقرر کر دیا۔ دولت مندوں اور تاجروں نے بے شمار عمارتیں بلا معاوضہ وزارتِ تعلیم کے حوالے کر دیں۔ جن میں سکول اور کالج کھولے گئے۔ انقرہ میں ایک یونیورسٹی کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ لڑکیوں کی تعلیم کا معقول بندوبست کیا گیا۔ اور زنانہ کالج میں انہیں ڈاکٹری، سائنس، انجینئرنگ اور قانون کی تعلیم دی جانے لگی۔

جولائی ۱۹۲۱ء تک خالدہ خانم کی خدمات سیاسی و تعلیمی رہیں۔ لیکن جب انہی دنوں ترکی جنگی جہازوں کے ذریعے سے یہ اطلاع ملی کہ یونانی لشکر انقرہ پر حملہ کرنے والے ہیں تو پورے اناطولیہ میں دفاعِ وطن کا جذبہ بپوری شدت سے دوبارہ بیدار ہو گیا۔ اس

موقع پر خالدہ خانم نے ترکی عورتوں کے لیئے ایک جنگی سکیم تیار کی جس کا مقصد یہ تھا کہ دفاعِ وطن کے لیئے ترک خواتین کا ایک لشکر بھرتی کیا جائے جس میں بعض رسد۔ باربرداری اعانت مجروحین وغیرہ کے کام انجام دیں۔ اور جو اپنے جذبے اور اہلیت کی وجہ سے لڑنے کے قابل پائی جائیں۔ وہ ترکوں کے لشکر کے پیچھے رہ کر جنگی خدمات انجام دیں۔ خالدہ خانم نے اس سکیم کے لیئے ملک بھر کا طوفانی دورہ کیا۔ ہزاروں عورتیں فوج میں بھرتی ہوگئیں، وزارتِ جنگ نے ان کی فوجی تربیت کا انتظام کر دیا۔ جب ہزاروں کو قواعدِ فوجی کی تعلیم دی جا چکی تو ان کے دستے بنا دیئے گئے۔ جو پلوں، تار گھروں اور ریلوے سٹیشنوں کی حفاظت کا کام انجام دینے لگے۔ بلکہ ایک ترکی نسوانی دستے نے اسمد کے علاقے میں یونانیوں پر نہایت کامیاب شبخون بھی مارے۔ اور جب ستمبر ۱۹۲۱ء میں یونانیوں کا سب سے بڑا حملہ ہوا تو خالدہ خانم نفسِ نفیس میدانِ جنگ میں موجود تھیں۔ اور ان کا نسوانی دستہ بھی ہمراہ تھا۔ اسی طرح "اینی بولی" کی مشہور جنگ میں جہاں فیلڈ مارشل عصمت پاشا فوج کی کمان کر رہے تھے۔ خالدہ خانم مجاہدین کے عقب میں اپنے نسوانی لشکر کے ساتھ موجود تھیں ایک ترکی نامہ نگار نے لکھا کہ اگر غازی عصمت پاشا ان نسوانی لشکروں کو پیش قدمی کرنے سے نہ روک دیتے تو خالدہ خانم یقیناً اس جنگ میں شہید ہو جاتیں۔ کیونکہ ان کا جوشِ جہاد ان دنوں نہایت بے پناہ تھا۔

یورپ اور امریکہ کے اخباروں میں ترکی خواتین کی عسکریت اور خالدہ خانم کی قیادت پر بے انتہا حیرت اور تحسین کا اظہار کیا گیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ترکوں کو از سرِ نو زندہ اور آزاد کرنے اور دنیا میں ترکی کا اعتبار و وقار از سرِ نو قائم کرنے میں جن لوگوں نے سب سے بڑھ چڑھ کر کام کیا۔ ان میں خالدہ خانم کا نام کسی اعتبار سے بھی کم محترم نہیں ہے۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو رافت پاشا نے اعلان کیا کہ قسطنطنیہ پر ترکانِ احرار کا قبضہ ہو چکا ہے اور اتحادی رخصت ہو چکے ہیں۔

آخر جنوری ۱۹۲۳ء میں ڈاکٹر عدنان بے کو حکم دیا گیا کہ وہ جا کر "انقرہ" پاشا سے قسطنطنیہ کی گورنری کا چارج لے لیں۔ چنانچہ خالدہ خانم اپنے جلیل القدر شوہر کے ساتھ اناطولیہ سے قسطنطنیہ پہنچ گئیں۔

خالدہ خانم ایک امریکن کالج کی گریجویٹ اور روشن خیال خاتون ہونے کی وجہ سے ہمیشہ مغربی طرزِ زندگی کی عادی رہیں۔ لیکن جب یورپ نے ترکوں کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا تو وہ زیادہ تر ترکی لباس اور رہن سہن کی پابند ہو گئیں۔ جب وہ میدانِ جنگ میں صحابہ کرام کی سنّت پر عمل کرتی ہوئی سیاہ عمامہ باندھ کر پہنچتی تھیں تو نوجوں میں جوش و خروش کا ایک عجیب عالم پیدا ہو جاتا تھا۔

خالدہ خانم عام طور پر نہایت خاموش و متین رہتی تھیں۔ لیکن جب تقریر پر آتیں تو فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیتیں۔ اس وقت ان کی عمر کم و بیش ۷۰ سال ہو گی اور وہ ضعیفی کے یہ ایّام نہایت سکون سے بسر کر رہی ہیں۔ لیکن ادب و شعر، اصلاحِ معاشرت جنگ و سیاست کے دوائر میں انہوں نے ترکی قوم اور عالمِ اسلام کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ رہتی دنیا تک تاریخ کے صفحات کو روشن کرتی رہیں گی۔

فاطمہ جناح

خادمۂ قوم و وطن

اب سے پچاس پچپن برس پہلے کراچی کا نقشہ بہت مختلف تھا۔ سندھ الگ صوبہ نہ تھا۔ صوبۂ بمبئی کا ایک حصّہ تھا۔ کراچی ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ بہت سے حصّے جہاں اب آبادی اور رونق اور چہل پہل ہے وہاں سمندر تھا۔ جہاں اب فریر گارڈن ہے۔ اور صدرِ مملکت کی کوٹھی ہے۔ جس میں قائدِ اعظم ایک سال تک پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے قیام فرما چکے ہیں۔ اس کے قریب قریب تک سمندر کی موجیں پہنچ جاتی تھیں۔ زیادہ تر آبادی بندر روڈ کی طرف تھی۔ اور یہیں قریب میں وہ مکان واقع ہے جس میں قائدِ اعظم محمد علی جناح پیدا ہوئے۔

قائدِ اعظم کی ہمشیرہ محترمہ مس فاطمہ جناح، جو قائدِ اعظم سے عمر میں بہت چھوٹی ہیں کراچی میں اسی مکان میں ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئیں۔ (اگر یہ تاریخ پیدائش صحیح ہے تو وہ عام خیال صحیح نہیں ہو سکتا کہ فاطمہ قائدِ اعظم سے بیس سال چھوٹی ہیں بلکہ ان دونوں کی عمروں کا فرق کوئی پچیس چھبیس سال بنتا ہے) ان کی عمر کے ابتدائی چند سال اس شہر کراچی میں گزرے۔ ان کی عمر آٹھ سال کی تھی کہ یتیم ہو گئیں۔ ان کے بھائی محمد علی جناح انہیں اپنے ساتھ بمبئی لے گئے اور ان کی تعلیم و تربیت اور پرورش کی ذمّہ داری اپنے سر لی۔

اوائل عمر ہی سے محترمہ مس فاطمہ جناح کو یہ خوش قسمتی نصیب ہوئی کہ ان کے اولو العزم بھائی نے ان کی تعلیم و تربیت کا بیڑا اٹھایا۔ بچپن ہی سے انہیں اپنے بھائی

سے غیر معمولی عقیدت اور محبت رہی۔

بمبئی کے امراء شرفا کے لڑکے اور لڑکیاں اکثر قرب و جوار کے ٹھنڈے پہاڑی قصبوں کے اعلےٰ درجے کے اسکولوں میں اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو پڑھانے کے لئے بھیجا کرتے تھے۔ پنچ گنی، کھنڈالا وغیرہ میں ایسے مدرسے اکثر تھے جن میں جدید طرز کی اعلےٰ تعلیم دی جاتی تھی۔ بمبئی کے مقابلے میں ان پہاڑی قصبوں کی آب وہوا اچھی ہے۔ یہاں نہ سمندر کی رطوبت ہے اور نہ موسم کی شدّت، مغربی گھاٹ کے پہاڑ سرسبز اور خوشنما ہیں۔ زیادہ تر اسکول انگریزوں نے اعلےٰ یورپی معیار کے مطابق کھول رکھے تھے۔ محمد علی جناح نے اپنی بہن فاطمہ کی پڑھائی کے لئے کھنڈالا کے اسکول کا انتخاب کیا۔ یہ مقام بمبئی کے قریب ہی مغربی گھاٹ کے سرے پر واقع ہے اور بمبئی سے پونا جانیوالی ریلیں یہیں سے ہو کر گزرتی ہیں۔

کھنڈالا کے اس مدرسے میں فاطمہ جناح نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد کچھ عرصے تک تعلیم کا سلسلہ منقطع رہا۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں انہوں نے دانتوں کی ڈاکٹری میں امتیاز پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا۔ اور دانتوں کی ڈاکٹری کی تعلیم کے لیے کلکتہ تشریف لے گئیں۔ اس زمانے میں بہت کم مسلمان عورتیں ڈاکٹری اور اس قسم کے دوسرے شعبوں میں برسرِ عمل آ رہی تھیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا تھا کہ کوئی خاتون پڑھ لکھ کر کسی اسکول یا کالج میں استانی بن جاتی لیکن دوسرے شعبوں میں مردوں کے دوش بدوش کام کاج کرنے یا ان کے برابر کے ہنر سیکھنے کی طرف خواتین نے زیادہ توجّہ نہیں کی تھی۔ مس فاطمہ جناح ان چند مسلمان خواتین میں ہیں جنہوں نے اس طرح کے شعبۂ زندگی کو انتخاب کیا تاکہ خلقِ خدا کی خدمت کر سکیں۔ اب بھی جب کہ لڑکیاں بڑی کثیر تعداد میں ڈاکٹری کے امتحان پاس کرنے لگی ہیں بہت کم مسلمان لڑکیاں دانتوں کی ڈاکٹری اور دندان سازی کی طرف توجّہ کرتی ہیں۔

چونکہ بیگم محمد علی جناح کا انتقال ہو چکا تھا اور گھر کے انتظامات کے لئے کسی نہ کسی خاتون کا وجود ضروری تھا اس لئے ۱۹۲۹ء میں مس فاطمہ جناح بمبئی واپس تشریف لائیں اور اپنے بھائی محمد علی جناح کے گھر کا کام کاج اور خانہ داری کی ذمّہ داری اپنے سر لی۔ ۱۹۲۹ء سے لے کر ۱۹۴۸ء تک یعنی انّیس سال انہوں نے اپنی زندگی اپنے بھائی کی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ ایسی جان نثاری کی مثالیں دنیا کی تاریخ میں کم ملتی ہیں۔ بھائی نے بچپن میں ان کی پرورش کی تھی۔ انہیں پڑھایا لکھایا اور اپنی اولاد کی طرح پالا پوسا تھا۔ اب بھائی کا بڑھاپا تھا۔ ان کی خبر گیری اور خدمت کو اپنا فرض جانا اور اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ قرار دیا کہ ان کو آرام و آسائش میسّر رہے تاکہ وہ اطمینان و انہماک سے اس عظیم الشان کام میں منہمک رہیں جس کے لئے خدا نے انہیں پیدا کیا تھا —— یعنی "تخلیقِ پاکستان"

قائدِ اعظمؒ کی سیاسی زندگی سے مس فاطمہ جناح کو ہمیشہ دلچسپی اور پورا تعلق رہا وہ ان کے ساتھ ۱۹۳۰ء میں لندن تشریف لے گئیں۔ جہاں گول میز کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں قائدِ اعظم نے مسلم لیگ کی از سرِ نو تشکیل کی۔ اس میں نئی جان ڈالی، اور برِ صغیر ہند و پاکستان کے مسلمانوں میں نئی جرأت و ہمت، نئی اولوالعزمی اور نیا سیاسی شعور پیدا کیا۔ شاید ہی اس برِ صغیر کے مسلمانوں نے کسی فردِ واحد کی اتنی عزّت و اطاعت کی ہو۔ اور اس کو اپنا واحد رہبر و پیشوا مانا ہو۔ جیسے انہوں نے قائدِ اعظم محمد علی جناح کو مانا اور ان کی رہبری میں اپنا صحیح مستقبل اور اپنا لائحہ عمل دریافت کیا۔

مس فاطمہ جناح قائدِ اعظم کی سیاسی سرگرمیوں میں برابر شریک رہیں۔ وہ کُل ہند مسلم لیگ شعبۂ خواتین کی صدر رہیں۔ مسلم خواتین کے سیاسی شعور کو بیدار کرنے میں جن چند ہستیوں نے بڑی گراں مایہ خدمت انجام دی ہے۔ ان میں مس فاطمہ جناح

کا مقام بہت افضل اور اعلےٰ ہے۔

ایک صفت مس فاطمہ جناح کو تمام سیاسی رہنماؤں سے ممتاز اور بالاتر قرار دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جس کی بدقسمتی سے ہمارے سیاسی راہنماؤں میں بڑی کمی ہے۔ وہ صفت یہ ہے کہ مس فاطمہ جناح نے اپنی ساری سیاسی زندگی میں اپنے لیے کبھی کوئی مقام یا درجہ یا منصب حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کوشش کرنا تو ایک طرف انہوں نے کبھی کسی منصب کو قبول کرنے پر آمادگی بھی ظاہر نہیں کی۔ ان کی سیاسی زندگی کا اصول یہ رہا کہ عوام کی راہنمائی کا راز عوام کی خدمت میں مضمر ہے۔ عوام پر سرداری میں نہیں۔ ان میں کبھی حُبِّ جاہ یا حُبِّ منصب پیدا نہیں ہوئی۔ حصولِ پاکستان کے بعد ان کے ذرا سے اشارے پر بڑی سے بڑی خدمت حکومت کی جانب سے انہیں پیش کی جا سکتی تھی۔ لیکن انہوں نے کبھی کسی منصب کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

حصولِ پاکستان کے بعد مس فاطمہ جناح کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔ جب قائداعظم نے پاکستان کے اولین گورنر جنرل کی حیثیت سے ملک کے نظم و نسق کا بیڑا اٹھایا تو سرکاری مہمان نوازی کی ذمہ داری مس فاطمہ جناح کے حصے میں آئی۔ ملک کی آزادی کے ساتھ ہی دوسری قوموں اور ملکوں سے سفارتی تعلقات قائم ہوئے۔ دوسرے ملکوں سے سفیر اور سیّاح اور سیاس پاکستان آئے اور قائداعظم سے ملتے رہے۔ یہ سب کے سب مس فاطمہ جناح سے مل کر بہت متاثّر ہوئے اور ان میں سے اکثر نے اپنی نگارشوں میں مس فاطمہ جناح کی بہت تعریف کی ہے۔ قائداعظم کے انتقال کے بعد بھی جتنے اکابرِ عالم پاکستان میں آئے۔ ان کا دائمی شیوہ رہا ہے کہ وہ اس محترم خاتون کی خدمت میں بطور خاص حاضر ہو کر عقیدت کا خراج پیش کرتے رہے ہیں۔

لیکن پاکستان کے حصول کے ساتھ ہی سب کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا

مشرقی پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے حصوں سے لاکھوں کی تعداد میں مہاجرین اور پناہ گیر چلے آرہے تھے۔ ادھر ہندوستان نے کشمیر پر قبضہ کر کے ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ پیدا کر دیا۔ کشمیر سے بھی مہاجرین کے آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور کشمیری مجاہدین ایک سال تک حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے رہے تاکہ کم از کم آزاد کشمیر کو ہندوستانی حملہ آوروں کے چنگل سے آزاد رکھ سکیں۔ اور اگر ممکن ہو تو مقبوضہ کشمیر کو از سرِ نو آزادی دلائیں۔

ان مسائل کے مقابلے کے لیئے مس فاطمہ جناح نے کراچی میں کئی ادارے قائم کئے۔ ان میں ایک ادارہ مہاجرین کی اعانت کے لیئے تھا۔ اس ادارے کی سرگرمیاں یہ تھیں کہ مہاجروں کی پناہ کے لیئے جو عارضی کیمپ تعمیر کیئے گئے تھے ان میں ان کی خبر گیری کی جائے۔ ان کی امداد کے لیئے چندہ فراہم کیا جائے۔ ان کے لیئے کپڑے اور دوائیاں اکٹھی کی جائیں۔ مہاجرین کی اعانت کے لیئے چندوں اور مینا بازاروں کے ذریعے کئی لاکھ کی رقم جمع کی گئی۔ رضا کاروں نے یتیم اور نادار مہاجر بچوں کو مفت تعلیم دینے کا سلسلہ شروع کیا۔

حصولِ پاکستان کے بعد محترمہ مس فاطمہ جناح نے ایک اور بڑی سماجی خدمت یہ انجام دی کہ اپنی نگرانی اور سرپرستی میں گرل گائیڈ تحریک کا آغاز کیا۔ آج بھی اسکولوں اور کالجوں کی گرل گائیڈ لڑکیاں مس جناح کو اپنی راہنما اور سرپرست سمجھتی ہیں۔ اس مفید تحریک سے بچپن ہی سے لڑکیوں میں خدمتِ خلق اور انسانی ہمدردی کا شعور اور احساس بیدار ہوتا ہے۔ ان میں تنظیم اور مساوات کی قدریں پیدا ہوتی ہیں اور ساتھ مل جل کر کام کرنے کا سلیقہ پیدا ہوتا ہے۔

پاکستان کے حصول کے سال بھر بعد پاکستانیوں کے سر سے ان کے محبوب قائدِ اعظم کا سایہ اٹھ گیا۔ ایک طرح سے ہمارا ملک یتیم ہو گیا۔ اب بھی اگر کوئی ہستی ہمیں قائدِ اعظم

کی یاد دلاتی ہے۔ جس کو دیکھ کر آنکھوں کے سامنے قائدِ اعظم کی جیتی جاگتی تصویر پھر جاتی ہے۔ تو وہ فاطمہ جناح کی ہستی ہے۔ خدا نے دونوں بہن بھائیوں کو بڑی مشابہت عطا کی تھی۔ صورت ہی سے دونوں بہن بھائی معلوم ہوتے تھے۔ سیرت میں بھی دونوں یکساں رہے۔ قائدِ اعظمؒ کی بہت سی صفتیں مِس فاطمہ جناح کو بھی نصیب ہوئیں۔ وہی وقار، وہی بے نیازی، وہی خلوص۔ دونوں نے کبھی باطل کے آگے سر نہیں جھکایا کبھی سیاست کو ذاتی منفعت کا ذریعہ نہیں بننے دیا۔ کبھی کسی قوّت یا طاقت سے خوف نہیں کھایا۔ کبھی صراطِ مستقیم سے سرِ مُو انحراف نہیں کیا۔ جو سچ سمجھا وہی زبان سے کہا۔ کبھی مصلحت کو قومی مفاد میں دخل انداز نہ ہونے دیا۔

قائدِ اعظم کے انتقال کے بعد مِس فاطمہ جناح نے ایک لحاظ سے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنی شروع کی۔ لیکن ہر ایسے موقع پر جب قوم کو راہنمائی یا رہبری کی ضرورت تھی انہوں نے علی الاعلان اپنی رائے کا اظہار کیا۔ جب کبھی انہوں نے یہ جانا کہ حکومت کی حکمتِ عملی میں تبدیلی کی ضرورت ہے انہوں نے اپنی رائے صاف صاف ظاہر کی۔ جب کبھی قوم کی ہمّت افزائی یا دردمندی کی ضرورت پیش آئی انہوں نے یہ محسوس کرایا کہ وہ زندہ ہیں اور قوم کے ساتھ ہیں۔ ان کے بے شمار بیانات اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے سے نشر ہو چکے ہیں۔ جن میں انہوں نے ہمیشہ راہنماؤں کو خود غرضی پر تنبیہ کی ہے۔ جمہوریت کی حمایت کی ہے اور عوام کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو دُور کرنے کی نصیحت کی ہے۔

آج پاکستان بھر میں کسی اور عورت کی اتنی عزّت اور وقعت نہیں جتنی فاطمہ جناح کی ہے۔ قوم نے انہیں "خاتونِ پاکستان" اور "مادرِ ملّت" کے القاب عطا کئے۔ یہ القاب اور کسی خاتون کے لئے آج تک استعمال نہیں کئے گئے۔ ان کی زندگی اور ہستی آج بھی قائدِ اعظم کی زندہ مثال اور زندہ یادگار ہے

ساری قوم نے انہیں اپنی ماں کا مرتبہ اور مقام عطا کیا۔ اس سے بڑا مقام کسی اور عورت کو حاصل نہیں ہو سکا۔

فاطمہ جناح کی ساری زندگی قربانیوں میں گزری۔ جب تک بھائی زندہ رہے انہوں نے اپنی زندگی ان کی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ جب بھائی مر گئے تو اپنی زندگی انہوں نے اس قوم کی بہتری اور خدمت کے لئے وقف کر دی۔ جسے ان کے بھائی نے ایک نئی زندگی عطا کی تھی۔

اپنی زندگی کو اس طرح قربان کر دینا بہت بڑی بات ہے۔ مس فاطمہ جناح نے شادی نہیں کی۔ ساری عمر اپنی ملت کی خدمت میں گزار دی۔ ان کے کردار کی عظمت کا ایک بہت بڑا پہلو یہ بھی ہے کہ ان کی حیا اور عفت ساری دنیا کی عورتوں کے لئے ایک بے مثل نمونہ ہے۔ اسلامی تہذیب کے دو بڑے خصائص یہ سمجھے جاتے ہیں۔ مردوں کے لئے مروت اور عورتوں کے لئے حیا۔ حیا کی یہ اسلامی صفت مس جناح کی شخصیت کا دلکش ترین پہلو ہے۔

ہم خوش نصیب ہیں کہ مس فاطمہ جناح ابھی زندہ ہیں۔ اور ہم لوگوں میں موجود ہیں۔ ان کی زندگی اور ان کی ہستی پاکستان کے لئے ایک طرح کی ڈھارس ہے۔ ہمیں اپنی قومی زندگی میں لاکھ معاشی یا سیاسی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑے۔ قائداعظم کی جیتی جاگتی تصویر اب بھی ہماری راہنمائی کے لئے نمونہ بن کر موجود ہے۔ پاکستانی عورتوں کے لئے ان کا وجود ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ ہر وہ صفت جو مسلمان عورت میں ہونی چاہئے۔ ان میں موجود ہے۔ کاش ہم سب اپنی زندگی میں فاطمہ جناح کی زندگی کا کوئی سبق اور کوئی اثر قبول کر سکیں۔

عطیہؔ بیگم فیضی

ماہرۂ فنونِ لطیفہ

عطیہؔ بیگم فیضی استنبول میں پیدا ہوئیں ۔ ان کے والد سلطان المعظم کے حاجب خاص تھے ۔ اور کئی زبانوں کے ماہر تھے ۔ آرمنی ، ترکی ، یونانی اور فرانسیسی بہت بے تکلفی سے بولتے تھے ۔ ان کا تعلق بمبئی کے ایک بہت معزز خاندان سے تھا ۔

انّیسویں صدی کے نصف آخر میں شاید ہی کسی مسلمان لڑکی کو تعلیم حاصل کرنے اور ادبیات اور فنونِ لطیفہ سے واقفیت حاصل کرنے کے مواقع ملے ہوں گے ۔ اس لحاظ سے عطیہؔ بیگم بہت خوش قسمت تھیں ۔ انہوں نے بہت اچھی تعلیم پائی ۔ ان کی طبیعت کا رجحان فنونِ لطیفہ کی طرف تھا ۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں لارڈ کرزن کے دربار میں انہوں نے دستکاریوں کی نمائش کی اور طلائی تمغے حاصل کئے ۔ ابھی وہ بہت کم عمر تھیں اسی زمانے میں دنیا کے مشہور مصنّفین اور فنکاروں سے ان کی ملاقات کا سلسلہ شروع ہوا چنانچہ سنہ ۱۹۰۲ء میں جب کلکتہ گئیں تو ٹیگور کے یہاں مہمان ٹھہریں ۔ ٹیگور کی بھتیجی سرلا دیوی گھوشل سے ان کی بہت دوستی ہوگئی ۔ اور اگلے سال انہوں نے اور سرلا دیوی نے مل کر دہلی میں تحریکِ آزادی وحقوقِ نسواں میں حصّہ لینا شروع کیا ۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں حکومت نے انہیں وظیفہ دے کے اعلےٰ تعلیم کے لئے ولایت بھیجا ۔ وہاں بھی یہ دستکاریوں کی نمائش میں دلچسپی لیتی رہیں ۔ ان میں سے بعض دستکاریوں کے نمونوں کو اس قدر پسند کیا گیا کہ رائل اسکول آف ایمبرائیڈریز میں ان کی نقل اتاری گئی ۔ اسی سال یہ انگلستان کے شاہی دربار میں بلائی گئیں ۔ لندن سے عطیہؔ بیگم

پیرس آئیں، اور یہاں کی ممتاز خواتین سے ملاقات کی جن میں مشہور عالم ایکٹرس سارا برنرڈ بھی شامل تھی۔ یہاں بھی دستکاریوں اور ملبوسات، کے جن نمونوں کی انہوں نے نمائش کی وہ بہت پسند کئے گئے۔ جرمنی، فرانس اور آسٹریا میں عطیہ بیگم نے یورپی موسیقی اور آپیرا کا مطالعہ کیا۔ اور دراصل اسی زمانے میں موسیقی سے ان کی دلچسپی شروع ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی سال کے ختم پر انہوں نے پونا میں موسیقی کی کانفرنس کی صدارت کی۔ دو سال بعد پھر یورپی موسیقی کے مزید مطالعے کے لیئے یورپ روانہ ہوگئیں۔ جب واپس آئیں تو ان کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی کہ برِ صغیر ہندو پاکستان کے فنونِ موسیقی و رقص کو جو معیوب سمجھتے جاتے تھے بطور فنونِ لطیفہ متعارف کرانے کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ لکھنؤ میں انہوں نے جدن، اچھن شاہزادی اور دوسری رقاصاؤں کے کتھک رقص کے مظاہرے دیکھے۔ کتھک رقص اودھ کے مسلمان بادشاہوں کا ترقی دیا ہوا ناچ ہے۔ ہندوستانی رقص کے چار دبستانوں میں یہ واحد رقص ہے جو ہند کے مسلم تمدن کی پیداوار ہے۔

اسی زمانے میں ان کی ملاقات علامہ شبلیؒ نعمانی سے ہوئی۔ علامہ شبلی نعمانی عطیہ بیگم سے بہت متاثر ہوئے۔ عطیہ بیگم مولانا کے علم و فضل کی وجہ سے ان کی بے حد عزت کرتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے بیگم بھوپال سے سفارش کر کے علامہ شبلی کے لیئے سیرۃ النبی کی اشاعت کے لیئے مالی امداد کا انتظام کیا۔ اس زمانے میں عطیہ بیگم نے بڑی کوشش کی کہ ندوہ اور دیوبند میں طالب علموں کی طرح لڑکیوں کی تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے۔ لیکن اس کوشش میں انہیں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں جب عطیہ بیگم یورپ کے تیسرے دورے سے واپس آئیں تو انہوں نے صوبہ بمبئی کے شمالی اضلاع میں مسلمان بچوں کی تعلیم کے لیئے کئی

مدرسے کھلوائے۔ اور میر صاحب خیرپور سے تیرہ ہزار روپے چندہ وصول کر کے لکھنؤ میں لڑکیوں کے لئے ایک مدرسہ کھلوایا۔

اس تمام عرصے میں سماجی اور تعلیمی خدمات کے ساتھ ساتھ وہ موسیقی کے مطالعے اور ہندوستانی موسیقی کو زیادہ بہتر طریقے سے روشناس کرانے کی کوششوں میں بھی لگی ہوئی تھیں۔ ۱۹۱۲ء میں عطیہ بیگم نے موسیقی پر اپنی پہلی کتاب کی ترتیب مکمل کی۔ اور اس کے بعد پیرس اور لندن میں انہوں نے ہندوستانی موسیقی پر کئی تقریریں ختم کیں۔

اس زمانے میں ایک مشہور و معروف مصور راحمین سے ان کی شادی ہوئی، یہ یہودی النسل تھے لیکن عطیہ بیگم سے شادی کرنے سے قبل مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔

موسیقی سے عطیہ بیگم کا شغف بڑھتا ہی گیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے زمانے میں یہ سارے برِصغیر ہندوستان کا دورہ کرتی رہیں۔ اور موسیقی کے متعلق معلومات اور تاریخی اور تحقیقی مواد حاصل کرتی رہیں۔ برِصغیر کے چپے چپے کا سفر کر کے ہر کہیں سے انہوں نے باکمال موسیقاروں کو ڈھونڈھ نکالا۔ اور زیادہ تر انہی کے زیرِ اہتمام ۱۹۱۶ء میں بڑودہ میں مشہور و معروف موسیقی کی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کے بعد سے بڑودہ کا دربار موسیقی کا بہت بڑا مرکز سمجھا جانے لگا۔ موسیقی کی اس کانفرنس میں رامپور، الور، اندور، جے پور، پونا، مدراس، تنجور اور میسور سے سو سے زیادہ باکمال مغنّی آئے تھے۔ اگلے سال موسیقی کی دوسری کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی اور نواب صاحب رامپور نے جو خود بھی موسیقی کے بڑے ماہر تھے صدارت کی۔

جنگِ عظیم کے خاتمے پر عطیہ بیگم نے مشرقِ بعید کا سفر کیا، چین، جاپان،

فلی پین اور ہوائی سے ہوتی ہوئی کناڈا اور الاسکا گئیں۔ یہاں سے ریاستہائے متحدہ امریکہ اور کیلی فورنیا سے لے کر نیویارک تک سفر کیا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں بھی انہوں نے زیادہ تر توجّہ موسیقی کے مطالعے پر صرف کی۔ اس سفر سے واپسی پر عطیہ بیگم تحریکِ آزادی ہند میں شریک ہو گئیں۔ کھادی کا انہوں نے بڑی شدّ و مد سے پرچار کیا۔ لیکن جلد ہی کانگریس سے بے تعلق ہو گئیں کیونکہ اب یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ مسلمانوں کا سماجی اور سیاسی مستقبل ہندو قوم سے الگ ہے۔

سیاست سے کنارہ کشی کر کے عطیہ بیگم نے پھر موسیقی کی طرف توجہ کی۔ ۱۹۲۳ء میں الٰہ آباد میں موسیقی کی کانفرنس منعقد ہوئی۔ رام پور بھی موسیقی کا بہت بڑا مرکز بنتا جا رہا تھا۔

۱۹۲۵ء میں جب علی گڑھ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا آغاز ہوا تو اس موقع پر عطیہ بیگم نے ایک بڑی یادگار تقریر کی جس میں عورتوں کے حقِ آزادی، ان کے حقِ تعلیم اور عورتوں کے لیے ایک یونیورسٹی کے قیام کی تجویز پر مبسوط خیالات کا اظہار کیا۔ اس مجمع میں قائدِ اعظم محمد علی جناح بھی تشریف رکھتے تھے۔ جب عطیہ بیگم کی تقریر ختم ہوئی تو وہ بے اختیار پلیٹ فارم پر آئے اور عطیہ بیگم کو ان کی اس ہمّت اور جرأت پر مبارکباد دی کہ انہوں نے تعلیمِ نسواں کے مسئلے کو اس قدر جوش و خروش سے قوم کے سامنے پیش کیا۔

اسی زمانے میں لندن کی نوزاک کمپنی نے فنِ موسیقی پر عطیہ بیگم کی سیر حاصل کتاب شروع کی۔ اور اسے مشرق اور مغرب میں بڑی غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس وقت تک برِ صغیر ہند و پاکستان کی موسیقی پر کوئی اچھی کتاب انگریزی میں نہیں شائع ہوئی تھی۔ اس زمانے کا انگریزی خواں طبقہ برِ صغیر

کی کلاسیکل موسیقی کی خوبیوں کو بھول چکا تھا۔ غلامانہ تقلید کا زمانہ عروج پر تھا۔ احیاءِ فنون اور نشاۃ ثانیہ کی تحریکیں زور نہیں پکڑنے پائی تھیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ خود مغرب اور خاص کر انگلستان میں برِ صغیر کی دیسی موسیقی کے متعلق کوئی عام فہم کتاب دستیاب نہ ہوتی تھی۔ اس لیئے عطیہ بیگم کی کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ مقبولیت کافی عرصہ تک رہی۔

بمبئی میں عطیہ بیگم نے "فنونِ لطیفہ" کا کلب قائم کیا جو اس قدر مقبول ہوا کہ بڑے بڑے بین الاقوامی مشاہیر جب بمبئی آتے اس میں شرکت کرتے۔ چنانچہ مادام کلارابٹ، برنرڈ شا اور گیلی کرچی نے اپنے ورودِ بمبئی کے زمانے میں اس کلب میں شرکت کی۔

۱۹۲۷ء سے عطیہ بیگم کا رجحان پھر سیاسیات کی طرف ہونا گیا۔ وہ اقبال کی شاعری کی بڑی دلدادہ تھیں۔ اور علامہ اقبال کی اور ان کی خط و کتابت اب شائع ہو چکی ہے۔ اسی زمانے میں وہ قائدِ اعظم محمد علی جناح اور مسلم لیگ کے لائحہ عمل سے بھی متاثر ہونے لگیں۔ اور اسی زمانے میں ان کے شوہر فیضی رحمین کو نئی دہلی کے پارلیمانی ایوان کی دیواروں کی نقاشی کی خدمت سپرد کی گئی۔ جہاں انہوں نے کئی زندۂ جاوید شاہکار بنائے۔ عطیہ بیگم موسیقی کی تدوین کے ساتھ ساتھ سیاسیات کی ثقافتی سطح پر کام میں مصروف تھیں۔ آغا خان مرحوم کی سرپرستی میں انہوں نے ایک اکاڈمی آف اسلام کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۳۴ء میں عطیہ بیگم نے اسلامی ممالک کا سفر کیا۔ یہاں انہوں نے قدیم اسلامی موسیقی پر تحقیق کی "کتاب الاغانی" کے نادر نسخے دیکھے اور اس کے بعد یورپ اور امریکہ کا ایک اور سفر کیا۔ جس میں ان کی زیادہ تر توجہ اوپیرا اور موسیقی کی محفلوں میں شرکت اور موسیقی کی تحقیق میں گزرا۔ بمبئی واپس آ کے ۱۹۴۲ء میں عطیہ بیگم نے اپنی معروف و مشہور کتاب "کلاسیکی موسیقی" شائع کی جو ان کی

پہلی کتاب کی طرح بے حد مقبول ہوئی۔

جب قیام پاکستان کا وقت آیا تو قائد اعظم محمد علی جناح نے عطیہ بیگم فیضی اور ان کے شوہر فیضی راحمین کو پاکستان آنے کی دعوت دی۔ قائد اعظم سالہا سال تک عطیہ بیگم کے پڑوسی رہے تھے۔ فنونِ لطیفہ کی جو خدمت وہ انجام دے رہی تھیں اسے استحسان کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور قائدِ اعظم کو اس کا احساس تھا کہ آزادی اور استقلالِ پاکستان کے ساتھ ملک کی ثقافتی جڑیں بھی مضبوط ہونی چاہئیں۔ اس لئے ہر جوہرِ کامل کا پاکستان آجانا مناسب ہے۔ عطیہ بیگم نے قائد اعظم سے وعدہ کیا کہ وہ اور ان کے شوہر پاکستان آئیں گے۔ اور ان کے ساتھ نہ صرف فیضی راحمین کی تمام تصویریں ہونگی بلکہ وہ تمام تصویریں اور آرٹ کے نوادر جو انہوں نے ساری عمر جمع کئے ہیں وہ بھی ہونگے تاکہ ان کا یہ خواب پورا ہو سکے کہ پاکستان میں آرٹ کا ایک اور میوزیم کھولا جائے۔

عطیہ بیگم نے قیام پاکستان کی خبر قاہرہ میں سُنی۔ ۱۹۴۷ء کے اواخر میں عطیہ بیگم کراچی آگئیں اور یہاں مستقل قیام کیا۔ فیضی راحمین بھی ان کے ساتھ ساتھ آئے۔ اور ان دونوں کے ساتھ آرٹ کا وہ سارا خزانہ تھا جو ان دونوں نے ساری عمر جمع کیا تھا۔ اب عطیہ بیگم کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح زمین مل جائے اور وہ اپنا میوزیم تعمیر کر سکیں۔ دونوں اب کافی ضعیف ہو چکے تھے۔ دونوں اپنی زندگی پاکستانی قوم کے لئے وقف کر چکے تھے۔ دونوں نے زندگی میں بہت آرام اٹھایا تھا۔ اور بہت کام بھی کیا تھا۔ اب صرف کام کرنے کا زمانہ تھا۔ بالآخر عطیہ بیگم کی ان تھک کوششوں کی بدولت "ایوانِ رفعت" تعمیر ہوا اور اس میں کراچی کا پہلا میوزیم قائم ہوا۔ اس میوزیم میں فیضی راحمین کے شاہکار ہیں۔ بعض بے نظیر تصویریں ہیں۔ پارچہ جات اور آرٹ کے دوسرے نایاب سامان کے نمونے ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں گورنر جنرل پاکستان نے اس میوزیم کا باقاعدہ افتتاح کیا۔

اب بھی کراچی کی ثقافتی اور سفارتی مجلسوں میں ایک پست قد ضعیف خاتون اور ایک سادہ مزاج دُبلا پتلا معمّر سا شخص اکثر نظر آتے ہیں۔ اس خاتون میں اب بھی بلا کی سرگرمیٔ عمل باقی ہے۔ جو اس عمر میں بہت غیر معمولی ہے۔ ان دونوں کی محفلوں میں امیر و غریب، سفیر اور طالب علم سب ہی شریک ہوتے ہیں۔ اور تہ دل سے ان کی عزّت کرتے ہیں۔ یہ دونوں یعنی عطیہ بیگم فیضی اور فیضی رحمین ایسی ہستیاں ہیں کہ ان کا وجود قوم کے لئے متبرک ہے۔ ان کے بعد اس بے غرضی اور سرگرمی سے کام کرنے والے شاید ہی پیدا ہوں۔

رعنا لیاقت علی خاں

مدبّر شوہر کی مدبّر بیوی

رعنا لیاقت علی خاں جن کے نام سے پاکستان کا بچّہ بچّہ واقف ہے، الموڑہ میں پیدا ہوئیں۔ یہ مقام شمالی ہند میں ہمالیہ کی ترائی میں واقع ہے۔ جس دن یہ پیدا ہوئی ہیں۔ الموڑہ میں برف و باد کے طوفان کا زور تھا۔ کچھ ایسی ہی طبیعت اور کام کاج اور اصلاح کی طوفانی صلاحیت قدرت نے ان کو بھی عطا کی ہے۔

بچپن میں ان کی طبیعت میں بڑا چُلبلا پن تھا۔ ویسے ان کے پانچ بھائی اور تین بہنیں اور ہیں۔ مگر یہ سب سے زیادہ تیز مزاج اور شوخ تھیں۔ بہت جلد ان کے دوسرے بھائی بہن ان کو اپنا سردار ماننے لگے۔ شرارتوں میں یہ اپنے سب بھائی بہنوں کی سردار تھیں۔

ابتدائی تعلیم انہوں نے نینی تال کے ولزلی ہائی سکول میں حاصل کی۔ پھر لکھنؤ آ کے ازابیلا تھابرن اسکول سے میٹرک کیا۔ اور ازابیلا تھابرن کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اسکول اور کالج میں بھی یہ سب طالبات میں بہت جلد ممتاز ہو گئیں۔ طالبات کی سرگرمیوں میں یہ پیش پیش رہتیں۔ ان کی طبیعت میں حاضر جوابی مزاح، بذلہ سنجی، اور شگفتگی، کچھ ایسی تھی کہ اگر ان کی سہیلیاں انکا دم بھرتی تھیں تو ان کی استانیاں بھی کہا کرتی تھیں "جہاں رعنا محفل میں آجائے محفل شگفتہ ہو جاتی ہے مگر مشکل یہ ہے کہ شریر بھی بہت ہے"۔

بی اے پاس کرنے کے بعد انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے معاشیات اور

عمرانیات میں ایم اے کا امتحان پاس کیا اور یونیورسٹی بھر میں اول آئیں۔ ایم اے کی ڈگری کے لیئے ان کے مقالے کا موضوع تھا۔ "صوبجات متحدہ ہند کی زراعت میں مزدور نیوں کا حصہ اور مقام"۔ اس مقالے کی بہت تعریف ہوئی اور اس موضوع پر یہ مقالہ عرصے تک سیر حاصل تصور کیا جاتا رہا۔

ایم اے کرنے کے بعد بھی تعلیم سے رعنا کا جی نہیں بھرا۔ کلکتہ سے انہوں نے تدریس کی مزید ایک ڈگری حاصل کی۔ اور کلکتہ ہی میں گوکھلے میموریل اسکول میں لڑکیوں کو پڑھانا شروع کیا۔ چھ ماہ کے عرصے میں انہیں دہلی کے اندر پرستھ کالج میں معاشیات کی پروفیسری مل گئی۔ اور یہ دہلی چلی آئیں۔ اس کالج میں ڈیڑھ سال تک وہ معاشیات پڑھاتی رہیں۔

اپریل ۱۹۳۷ء میں لیاقت علی خاں سے ان کی شادی ہوئی جو دس سال بعد پاکستان کے پہلے وزیر اعظم ہونے والے تھے۔ یہ شادی قدرت کی طرف سے رعنا لیاقت علی خاں کی عظیم الشان اصلاحی اور تخلیقی صلاحیتوں کو عمل میں لانے کا ذریعہ اور انتظام تھا۔ کہتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ اس شادی میں یہ مصلحت مضمر تھی کہ بیگم لیاقت علی خاں پاکستانی عورتوں میں ایک روز اصلاح و خدمت و ایثار کا ایسا جذبہ پیدا کریں جس کی نظیر شاید ہی کہیں مل سکے۔ اُن کی ان خدمات کا تو ہم آگے چل کے ذکر کریں گے۔ یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ بیگم لیاقت علی خاں کی خدمات پاکستان بننے کے بعد شروع نہیں ہوئیں۔ ۱۹۳۷ء میں قائد اعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی ازسر نو تنظیم کی۔ اس میں ایک نئی جان ڈالی اور ۱۹۴۰ء میں پاکستان کی تجویز کو مسلم لیگ کا لائحہ عمل بنایا گیا۔ لیاقت علی خاں کُل ہند مسلم لیگ کے سیکرٹری اور قائد اعظم کے دستِ راست اور معتمد خاص تھے۔ سیاسی امور میں بھی بیگم لیاقت علی خاں نے اسی وقت سے قائد ملت لیاقت علی خاں کا ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ مسلم لیگ کے

پاس اس زمانے میں بہت کم سرمایہ تھا۔ کوئی باقاعدہ دفتر نہ تھا۔ سارا دفتری کام لیاقت علی خاں کو کرنا ہوتا اور ان کی ساری خط و کتابت اور ٹائپ کرنے کا سارا کام بیگم لیاقت علی خاں انجام دیتی تھیں۔ غیر سرکاری طور پر وہ مسلم لیگ کے سیکرٹری لیاقت علیخاں کی سیکرٹری تھیں۔

سیاسی دفتری کام اور خط و کتابت میں ہاتھ بٹانے کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی اپنے شوہر کو سیاسی زندگی میں مدد دیتی تھیں۔ جو شخص ان سے ملنے آتا ان کے اخلاق، خوش طبعی اور ذکاوت سے متاثر ہوتا۔ اسی زمانے سے بیگم لیاقت علی خاں کو اس کا شدید احساس پیدا ہوا کہ جو بدنصیب انسان معاشی یا سماجی تکلیفوں میں مبتلا ہیں۔ یا جنہیں زندگی میں ترقی کے موقعے نہیں ملے یا جو اتفاقیہ حوادث کا شکار ہو گئے۔ ان کی اور ان کے متعلقین کی نگہداشت اور دستگیری انسانیت کا ایک بہت بڑا اور اہم فرض ہے۔ سیاست ان کے نزدیک انسانیت کا دوسرا نام ہے۔ اور اگر ان کے شوہر قائد ملت لیاقت علی خاں جمہوری اصول کے مطابق، قائد اعظم کی قیادت میں مسلمانوں کا سیاسی مستقبل مستحکم کرنے کی کوشش کر رہے تھے تو بیگم لیاقت علی خاں نے اسی اصول کو افراد کی دستگیری اور ہمدردی میں اختیار کیا۔ اور اس دستگیری اور ہمدردی کو ایک رضاکارانہ تحریک بنانے کی کوشش شروع کی۔

بیگم لیاقت علی لیاقت کے بطن سے دو فرزند پیدا ہوئے۔ اشرف ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو اور اکبر ۱۰ اپریل ۱۹۴۱ء کو۔ بیگم لیاقت علی خاں نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود ان دونوں لڑکوں کی بڑی محنت اور انہاک سے پرورش کی۔ اور ان کی تربیت کو اپنا اہم ترین فرض جانا۔ کیونکہ عورت اگر ماں نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ قائد ملت کی خدمت میں اس قدر منہمک رہتے تھے کہ انہیں اپنی اولاد پر زیادہ توجہ دینے کا موقع نہ ملتا تھا۔ بیگم لیاقت علی خاں باپ کے حصّے کا پیار اور انہماک بھی ان دونوں لڑکوں پر

صرف کرتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ قائدِ ملت برِ عظیم کے سب مسلمانوں سے اپنی اولاد کی طرح محبت کرتے ہیں۔ اس لئے خود اپنی اولاد سے زیادہ لاڈ پیار نہیں کرتے تھے۔ بیگم لیاقت علی خاں شروع ہی سے بڑی گھریلو خاتون تھیں۔ اور اولاد کی تربیت کو اپنا اوّلین فرض سمجھتی تھیں۔ شوہر اور بچّوں کے ساتھ ساتھ گھر میں ان کے دو مشغلے اور تھے۔ موسیقی اور کتابیں۔ انہوں نے خود اپنے دونوں بچّوں کو انگریزی موسیقی کی تعلیم دی۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان وجود میں آیا۔ قائداعظم محمد علی جناح نے لیاقت علیخاں کو پاکستان کا وزیرِاعظم منتخب فرمایا۔ لیکن یہ عہدہ ایک ایسی کلاہِ دلکش تھا جس کے ساتھ دردِ سر کی کوئی انتہا نہ تھی۔ یوں تو ہر نئے ملک میں نظم و نسق کی ذمّہ داری بڑی شدید ہوتی ہے۔ لیکن پاکستان میں "احسان ہم سایہ" سے کچھ ایسے غیر معمولی حالات پیدا ہو گئے تھے جن کا مقابلہ آسان نہ تھا۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتلِ عام کے بعد لاکھوں کی تعداد میں مہاجرین مغربی پنجاب منتقل ہو رہے تھے۔ لیاقت علی خان نے کچھ عرصہ کے لئے کراچی کو چھوڑ کے لاہور کو اپنا مستقر بنالیا۔ ان غریب پناہ گزینوں کے ساتھ ساتھ بیماریاں بھی آئیں۔ افلاس اور بیماری کا ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ مہاجرین میں سے جو راستے کی صعوبتیں جھیلنے کے بعد بھی زندہ رہے۔ ان میں ہیضہ بھی پھوٹ پڑا۔ ٹیکے کی دوا نایاب تھی۔ مہاجروں کے جمِّ غفیر جابجا سرگرداں تھے اسپتالوں میں اتنی گنجائش کہاں تھی کہ لاکھوں مخلوق کا علاج ہو سکتا سرکاری طور پر جس قدر امداد کی جا سکتی تھی اس کو لیاقت علی خاں نے اس وقت اپنا اولین فرض تصور کیا۔ اس ابتلا اور مصیبت کے زمانے میں بیگم لیاقت علی خاں نے باقاعدہ سماجی خدمت اور بنی نوعِ انسان کی امداد کی تنظیم کا آغاز کیا۔ یہ تنظیم انہوں نے ایک تحریک کی شکل میں شروع کی۔ سب سے پہلے اس تحریک کی تشکیل ایک جماعت کی ہوئی جس کو انہوں نے

جمعیت رضاکار خواتین پاکستان کا نام دیا۔ اس وقت تک عورتوں کو سماجی خدمت اور حاجت مندوں کی امداد کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ گھر میں بیٹھنے والیاں یہ نہیں جانتی تھیں کہ گھر سے باہر بھی خلقِ خدا ان کی ہمدردی اور ان کی دستگیری کی محتاج ہے۔ ان ناتجربہ کار خواتین کو سماجی کارکنوں کی منظم جماعت بنانا، ان سے فی الفور لاکھوں مصیبت زدہ نادار، بیمار، محتاج بندگانِ خدا کی خدمت کا کام لینا بڑا مشکل کام تھا لیکن بیگم لیاقت علیخاں نے اس عظیم مہم کا بیڑا اٹھا لیا۔

اس میں انہیں جو کامیابی ہوئی وہ حیرت ناک ہے۔ جب قوم پر وقت آن پڑا تو نسوانی حمیت اور ہمدردی اور انسانیت کے جو جذبات پاکستانی خواتین میں قدرۃً موجود تھے۔ وہ اس مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لیئے اس قدر تیزی سے اور اتنی کامیابی سے منظم ہو گئے کہ تعجب ہوتا ہے۔ وہ عورتیں جنہوں نے کبھی گھر کی چہار دیواری سے باہر قدم نہ نکالا تھا۔ جوق در جوق سینکڑوں کی تعداد میں اسپتالوں میں مہاجرین اور مہاجرات کے کیمپوں میں سڑکوں کے کناروں پر پڑے بیمار اور دم توڑتے ہوئے مریضوں کی خدمت کرنے لگیں۔ انہوں نے بیواؤں اور یتیموں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بیگم لیاقت علی خاں کی تحریک پر ایک تلاشِ روزگار کا محکمہ کھولا گیا۔ ایک محکمہ تلاشِ گم شدگاں کے لیئے قائم کیا گیا۔ ایک شعبہ ایسا کھولا گیا کہ شادی کے قابل لڑکیوں کے لیئے بَر تلاش کئے جائیں۔ بیواؤں کے لیئے گھر فراہم کیئے گئے۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں ساٹھ ہزار مسلمان عورتیں اغوا کی گئی تھیں۔ ان کی بازیافت کے لیئے مراکز کھولے گئے۔ رضاکار خواتین کے دوش بدوش خود بیگم لیاقت علی خاں بیماروں کی تیمارداری کرتیں۔ مہاجر کیمپوں کا معائنہ اور دورہ کرتیں۔ سواریوں کا انتظام کرتیں۔ خوراک اور رسد کی تقسیم کی نگرانی کرتیں۔ ایسے معذور اور درماندہ مہاجر مسافروں کو کمبل، غذا، کپڑے اور دوائیں تقسیم کرتیں۔ جن میں اتنی سکت بھی نہ رہی

تھی کہ امداد کے مرکز یا مہاجر کیمپ تک پہنچ سکیں۔ بیگم لیاقت علی خاں پاکستان کے وزیراعظم کی بیوی تھیں۔ چاہتیں تو ہر طرح کے عیش و آرام میں گزر کرتیں۔ لیکن وہ اپنی ساتھی رضا کار خواتین کے ساتھ گھنٹوں لکڑی کی کھُری بنچوں پر بیٹھ کے محتاج عورتوں کو ضروریات کی چیزیں تقسیم کرتیں۔ دواخانوں اور رسد کے مرکزوں سے سب کے ساتھ خود سامان فراہم کرنے میں حصّہ لیتیں۔ ہیضہ اور ایسے دوسرے متعدّی امراض کے مریضوں کی تیمارداری کرنے میں انہیں کبھی یہ خیال نہ آیا کہ وہ خود اپنی اور اپنے بچّوں کی جانیں خطرے میں ڈال رہی ہیں۔

جب ایک مرتبہ پاکستانی خواتین میں رضاکارانہ خدمت کی تحریک جڑ پکڑ گئی تو بیگم لیاقت علی خاں نے رفتہ رفتہ اس کو مستقل شکل دینے کی کوشش شروع کی۔ مہاجرین کی آمد ایک ہنگامی صورتِ حال تھی۔ لیکن پاکستان کے اسپتالوں کو بہر حال مستقل طور پر نرسوں کی ضرورت تھی۔ مسلمان لڑکیاں جو ابھی تک کہنہ خیالی اور دقیانوسی تعصّبات کے ماحول میں پل رہی تھیں یہ نہیں سمجھ پائی تھیں۔ کہ خلقِ خدا کی خدمت سے بڑھ کر اور کوئی عبادت نہیں۔ اور خلقِ خدا کی خدمت میں انسان جتنی تکلیف اٹھائے وہ خدمت اتنی ہی مستحسن ہے۔ اسپتال میں بیمار بغیر عیادت کے زندہ نہیں رہ سکتے، عیادت کی جو صلاحیت عورتوں میں ہے وہ مردوں میں نہیں۔ اس لئے نرسنگ کو دنیا بھر میں بڑا معزز اور قابلِ تحسین پیشہ سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے اب یہ کوشش شروع کی کہ اچھے گھرانوں کی مسلمان لڑکیاں نرسنگ کی طرف مائل ہوں۔ بیگم لیاقت علیخاں نے اس تحریک کو مقبول بنانے کے لئے ڈاکٹروں سے مشورے کئے، کمیٹیوں میں شرکت کی۔ اس کی کوشش کی کہ نرسوں کی سماجی حیثیت کو بلند کیا جائے۔ اور قوم انہیں عزت اور وقار کی نظروں سے دیکھے۔ انہوں نے پاکستانی نرسوں کو یورپ اور امریکہ بھیج کر تعلیم دلوانے کا سلسلہ شروع کیا۔ انہوں نے بڑی ہمت سے ہر طرح پرانے

تعصبات کا مقابلہ کیا اور نرسنگ کے پیشے کو عزت بخشنے کے لئے نئی قدروں کو رائج کرنے کی کوشش کی۔ اس میں انہیں کافی کامیابی ہوئی۔ پاکستان کے اسپتالوں میں نرسوں کی کوئی قلت نہیں رہی۔ یہ اور بات ہے کہ ابھی ہمارے نئے ملک میں مزید اسپتالوں اور ہزاروں نرسوں کی ضرورت ہے۔

ایک طرح کی قومی تحریک اور تنظیم سے اسی نوعیت کی دوسری تنظیموں اور تحریکوں کا راستہ ہموار ہوتا ہے۔ نرسنگ کی ضرورت کے ساتھ ساتھ بیگم لیاقت علی خاں نے یہ بھی محسوس کیا کہ مسلمان لڑکیوں کی جسمانی صحت صدیوں کی گھٹن کی وجہ سے گرتی جا رہی ہے۔ ایک ایسی تحریک ضروری ہے کہ یہ اپنی صحت بہتر بنا سکیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس قابل بن سکیں کہ اپنی حفاظت آپ کر سکیں۔ ہزارہا مسلمان لڑکیاں ۱۹۴۷ء کے فسادات میں مشرقی پنجاب، دہلی اور مغربی یو۔ پی میں اغوا کر لی گئیں۔ اگر ان کو اپنی مدافعت کرنے کے گر سکھائے گئے ہوتے تو ان میں سے بہت بڑی تعداد اپنے آپ کو دشمنوں کی غنڈہ گردی سے بچا سکتی۔ اس ضرورت کے پیش نظر بیگم لیاقت علی خاں نے پاکستانی خواتین کے قومی محافظ دستے کی تنظیم شروع کی۔ اور اس تنظیم کی قیادت انہوں نے خود اپنے ہاتھ میں لی۔ پاکستان کے شہروں میں ان لڑکیوں کو نیم عسکری تعلیم دی گئی، جنہوں نے رضاکارانہ طور پر اس دستے میں شامل ہونا منظور کیا۔ ان لڑکیوں کو فوجی قواعد اور پریڈ، ابتدائی نرسنگ، حادثات میں ابتدائی امداد، شہری بچاؤ اور سماجی خدمت کی تربیت دی جانے لگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کی آبادی کو دیکھتے ہوئے لڑکیوں کی بہت بڑی تعداد کو اس تحریک میں حصہ لینا چاہیئے تھا لیکن یہ کیا کم ہے کہ متوسط طبقے کی ڈھائی ہزار لڑکیاں عورتوں کے نیشنل گارڈ میں شریک ہوئیں۔ یہ تحریک صرف کراچی، لاہور اور ڈھاکہ میں شروع ہوئی بہرحال تحریک کی ابتدا تو ہو گئی اور مستقبل کے لئے راستہ ہموار ہو گیا۔ سب سے بڑی رکاوٹ پرانے تعصبات اور

قدامت پسندی کی تھی، اس رکاوٹ کو دُور کرنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

بیگم لیاقت علی خاں چونکہ معاشیات اور عمرانیات میں فارغ التحصیل تھیں۔ انہیں اس کی بڑی فکر تھی کہ ملک کے دستکاروں کی معاشی تنظیم کی جائے۔ اور ایسی صورتیں پیدا کی جائیں کہ ان کا معیارِ زندگی بلند ہو سکے۔ ان کی محنت کا ثمرہ انہی کو ملے۔ اور بیچ کے منافع خور انہیں لوٹنے نہ پائیں۔ بیگم صاحبہ نے مصنوعاتِ دیہی کی ایک انجمن مارچ ۱۹۴۸ء میں قائم کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ گھریلو مصنوعات کی سرپرستی کی جائے۔ کاریگری کے جو طریقے اور ہُنر معدوم ہو رہے ہیں انہیں پھر سے تازہ کیا جائے۔ کاریگروں کی معاشی تنظیم کی جائے، دیہاتی اور مہاجر کاریگروں کو اپنی محنت کا خاطر خواہ معاوضہ ملے۔ اس مقصد کے لیئے بہت سی خواتین نے چندے کی فراہمی میں بیگم صاحبہ کا ہاتھ بٹایا۔ اور جون ۱۹۴۹ء میں گھریلو مصنوعات کی فروخت کا ایک مرکز کراچی میں قائم کیا گیا۔ چند خواتین بلا معاوضہ رضاکارانہ طور پر اس مرکز میں کام کرتی ہیں۔ اس مرکز کو بہت جلد منافع ہونے لگا اور اس کے منافع سے دوسرے کارہائے خیر کے لیئے امداد کا بندوبست کیا گیا۔ زنانہ اسپتالوں اور دق وسِل کے اسپتالوں کو عطیئے دیئے گئے۔ اور مہاجر بچّوں کے اسکولوں کی امداد کی گئی۔ رفتہ رفتہ کاریگروں کے لیئے ایک پورا محلّہ الگ بنایا گیا جس میں ایک اسپتال بھی تعمیر کیا گیا۔ عورتوں کے لیئے "گلِ رعنا نصرت مرکزِ مصنوعات" قائم کیا گیا۔ یہاں نادار مہاجر عورتوں کو سوزن کاری اور سینے پرونے کے کام کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جو عورتیں یہاں کام سیکھتی ہیں انہیں کام کا معاوضہ بھی دیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ایک اسکول ہے جس میں ان عورتوں کے بچّے تعلیم پاتے ہیں۔ ان عورتوں کی سوزن کاری اور کاریگری کا کام باہر سے آنے والے لوگ بہت شوق سے خریدتے ہیں۔

بیگم لیاقت علی خاں کا سب سے بڑا کارنامہ "اپوا" یعنی کل پاکستان انجمنِ خواتین

کی تشکیل اور تنظیم ہے ۔ اس کی وجہ سے ان کا نام پاکستان کی سماجی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ ۲۲ فروری ۱۹۴۹ء کو پاکستان بھر سے انہوں نے ایسی خواتین کو مدعو کیا جو زندگی کے مختلف شعبوں میں مفید اور کارآمد کام انجام دے رہی تھیں، پاکستان بھر کی خواتین کی یہ انجمن سب کی انجمن ہے، اس کی شرکت کے لئے رتبے درجے، مذہب، فرقے کی کوئی قید نہیں۔ اس کا سیاست سے کوئی سروکار نہیں۔ اس انجمن کا مقصد پاکستانی عورتوں کی سماجی، تعلیمی اور ثقافتی اصلاح ہے۔ اس کی شاخیں صوبے صوبے اور ضلع ضلع میں موجود ہیں۔ حکومتِ پاکستان ان امور میں اس انجمن سے مشورہ لیتی ہے جو عورتوں کی فلاح و بہبود سے متعلق ہوں۔ اور دوسرے بین الاقوامی ادارے اس انجمن کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس سے تعاون کرتے ہیں۔ اپوا کی زیرِ نگرانی کئی کالج اور اسکول کھولے گئے ہیں۔ اسپتال قائم کئے گئے ہیں۔ امورِ خانہ داری کی تعلیم کا خاص انتظام کیا گیا ہے۔ عورتوں کے حقوق کی حفاظت اور بچوں کی صحیح تربیت اس انجمن کے اہم مقاصد ہیں۔ پاکستان میں عورتوں کا مرتبہ بلند کرنے، تعدّدِ ازدواج اور عورتوں کے حقوق کی پامالی کے روکنے میں اس انجمن نے بڑا بیش بہا کام انجام دیا ہے۔ اس انجمن کا بڑا مقصد یہ ہے کہ پاکستانی عورت کو ماں، بہن اور بیوی ہونے کے فرائض اور ذمہ داری کا احساس دلایا جائے اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے ان کی صحیح ذہنی تربیت کی جائے۔ بیگم لیاقت علی خاں نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا "جب لڑکے کو تعلیم دی جاتی ہے تو ایک فردِ واحد کو تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن جب لڑکی کو تعلیم دی جاتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ سارا گھر تعلیم پاتا ہے۔"

بیگم لیاقت علی خاں نے اپوا کے ذریعے اور دوسرے اداروں میں تعلیمِ نسواں کو فروغ دینے۔ اور اس کو جدید ترین مغربی نظامِ تعلیم کے معیار تک لانے کی مسلسل

کوشش کی ہے۔ پاکستان میں امورِ خانہ داری کے کالج کھلوانے میں ان کا بڑا دخل ہے۔ تعلیمی ادارے اپوا کے پروگرام کا بڑا اہم جزو ہیں۔

اس خلوص اور جانفشانی کے ساتھ بیگم لیاقت علی خاں پاکستان کی عورتوں کی خدمت کر رہی تھیں۔ کہ ان پر وہ سانحہ گزرا جس سے زیادہ شدید مصیبت ایک عورت پر نازل نہیں ہو سکتی۔ ان کے شوہر لیاقت علی خاں راولپنڈی کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے ایک غدار کی گولی کا نشانہ بن گئے۔ پاکستان نئے سرے سے یتیم ہو گیا۔ یہ سانحہ ۱۶ راکتوبر ۱۹۵۱ء کو پیش آیا۔ ساری قوم ماتم کناں تھی۔ کراچی میں شہیدِ ملت کا جنازہ اٹھ رہا تھا۔ عین اسی روز کراچی میں بندر روڈ پر سیونتھ ڈے اڈونٹسٹ اسپتال کا افتتاح ہونے والا تھا۔ بیگم لیاقت علی خاں افتتاح کرنے والی تھیں۔ کوئی اور عورت ہوتی تو عظمتِ کردار کا اس طرح اظہار نہ کر سکتی۔ اور اپنے غم میں انسانوں کی فلاح و بہبود کو بھول جاتی۔ لیکن اگر ان کے شوہر اور قوم کے سردار کو شہادت نصیب ہوئی تھی تو شہر میں ایک نئے اسپتال کا قائم ہونا سینکڑوں اور ہزاروں کے لئے زندگی اور صحت کی نوید تھی۔ بیگم لیاقت علی خاں جو اس المناک سانحہ سے چور چور تھیں خود تو اسپتال کی افتتاح کے لئے نہ جا سکیں لیکن ٹیلیفون پر انہوں نے یہ پیغام بھیجا:۔

"اللہ ہی پیدا کرنے والا ہے، وہی جلانے والا ہے اور وہی مارنے والا ہے۔ لیکن بنی نوعِ انسان کی خدمت کا جو فرض اللہ نے ہمارے سپرد کیا ہے اس کی پابندی لازمی ہے۔ مجھ پر جو صدمہ پڑا ہے وہ کتنا ہی عظیم اور جاں گداز سہی، انسانوں کی خدمت اب بھی میرا فرض ہے اور اس فرض کو پورا کرنے کے لئے میں سیونتھ ڈے اڈونٹسٹ اسپتال کا افتتاح کرتی ہوں۔

شہیدِ ملت لیاقت علی خاں کی شہادت کے بعد بیگم صاحبہ نے گوشہ نشینی اختیار کر لی مگر ساتھ ہی ساتھ سماجی کاروبار، اپوا اور دوسرے قومی اداروں کی تنظیم اور ان کو فروغ دینے کی مساعی سے لمحہ بھر کے لئے غافل نہ ہوئیں۔ آج بھی پاکستان کی خواتین، اور خاص طور پر ایسی خواتین جو سماجی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ ان کو اپنی رہبر اور راہنما مانتی ہیں۔ ان کی بے حد عزت کرتی ہیں۔ بیگم لیاقت علی خاں میں سرداری کی جو خداداد صلاحیت ہے اس کی بنیاد لطف و عنایت اور محبت پر ہے۔ ان کے ساتھ کام کاج کرنے والی رضاکار خواتین ان کے خلوص اور ان کی انسانیت کی گرویدہ ہو جاتی ہیں۔ اور ان کے اشارے پر دوڑ دوڑ کر کام کرتی ہیں۔

حکومتِ پاکستان نے مسلسل اس کی کوشش کی کہ بیگم لیاقت علی خاں کی خداداد قابلیت سے قوم کو برابر فائدہ پہنچتا رہے۔ ۱۹۵۲ء میں ان کو پاکستان کی جانب سے مندوب بنا کے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ساتویں اجلاس میں شرکت کے لئے بھیجا گیا۔ اور ۴ ستمبر ۱۹۵۴ء کو یہ پاکستان کی پہلی خاتون سفیر بن کے ہالینڈ گئیں۔ بیگم لیاقت علی خاں سے پہلے پاکستان تو کیا سارے عالمِ اسلام میں اور کسی خاتون کو سفارت کی خدمت پر مامور نہیں کیا گیا تھا۔ بہت جلد پاکستان کی طرح ہالینڈ میں بھی بچہ بچہ ان کا گرویدہ ہو گیا۔ بہت کم کسی سفیر کو ایسی ہر دلعزیزی اور کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ جو بیگم لیاقت علیخاں کو ہالینڈ میں حاصل ہے

۱۹۵۵ء میں شہیدِ ملت کی برسی کے کچھ ہی دن بعد وہ کچھ دنوں کے لئے پاکستان آئیں۔ قوم نے، اور خصوصاً قوم کی عورتوں نے جس جوش و خروش سے ان کا استقبال کیا۔ ان کے لئے آنکھیں بچھائیں۔ اس کی نظیر مشکل

سے ملے گی۔

جو کام بیگم لیاقت علی خاں نے شروع کیا تھا، اب بھی جاری ہے۔ جو پہلے محض ایک تحریک تھی۔ اب ایک مستقل معاشری شعور بن چکی ہے۔ عورتوں کی ذہنی، معاشری، معاشی اور سیاسی ترقّی میں بیگم رعنا لیاقت علی خاں نے جو حصّہ لیا ہے وہ قوم کی تاریخ میں یادگار رہے گا؛

زبیدہ آغا

مصوّرہ

تاریخ اسلام میں ایسی خواتین تو ملیں گی جنہوں نے سیاست میں حصّہ لیا بلکہ سلطنتیں سنبھالیں۔ ایسی بھی خواتین ہیں جنہیں علم وادب کا ایک خاص ذوق تھا۔ قرۃ العین طاہرہ کے درجے کی نہ سہی۔ لیکن اس سے کم درجے کی شاعرات بھی عربی، فارسی، اردو اور ترکی میں ادب کو آراستہ کرتی رہیں۔ لیکن بہت ہی کم ایسی خواتین ملیں گی جنہوں نے موسیقی کے سوا کسی اور فنِ لطیف میں نام پیدا کیا ہو۔ خصوصاً مصوری ایک ایسا فن ہے جس میں شاید ہی کسی مسلمان خاتون نے غیر معمولی شہرت حاصل کی ہو۔

اس کی کئی وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ صورت گری اسلام میں نامقبول رہی۔ ہمارے تمدن کی روح اپنے آپ کو دو فنونِ لطیفہ میں ظاہر کرتی ہے۔ فنِ تعمیر اور شاعری۔ اس کے بعد ایک حد تک موسیقی کی باری آتی ہے۔ غرض ایسے فنون جن میں صورت نہ بنے زیادہ مقبول رہے۔ اور انہی میں کمال حاصل کیا جاتا رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دستکاری میں عورتوں نے بڑا کمال پیدا کیا۔ لیکن چونکہ دستکاری کی چیزیں عام طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ اور تھوڑے دن برتنے کے بعد ضائع ہو جاتی ہیں۔ اس لئے وہ فنِ تعمیر کے شاہکاروں کی طرح باقی نہ رہ سکیں۔

مصوری کا آغاز یوں تو بنی امیہ میں بازنطینی اثرات سے ہوتا ہے لیکن

اس میں اسلامی قوتِ تخلیق کو بہت کم دخل تھا۔ خلفائے بنی امیّہ کے محلوں کے لِئے جو تصویریں بازنطینی مصوّروں نے بنائیں ان سے مصوّری کی کوئی روایت پیدا نہ ہو سکی۔

صحیح معنوں میں مصوّری کا عام رواج ایران میں مغلوں کے حملے کے بعد ہُوا۔ جہاں مغل فاتح عالمِ اسلام کے لِئے قہرِ الٰہی تھے۔ وہاں انہوں نے دوسرے تمدنوں کے بہت سے اثرات عالمِ اسلام تک پہنچائے۔ مغلوں ہی کے زمانے میں چینی مصوری کا اثر ایران پر پڑا۔ ایران میں اس مصوّری نے ایک خاص دلپذیر شکل اختیار کر لی۔ اس کتب مصوّری کی انتہا ہرات میں ہوتی ہے۔ جہاں بہزاد جیسا مصوّر اپنے شاہکار بناتا رہا۔ اور پھر یہی اثر مغل مصوّری میں منتقل ہُوا۔ اور برِ صغیر ہندو پاکستان میں پھیل گیا۔

مغل عہد میں اور اس کے بعد مصوّری کا تعلق شاہی دربار یا امرا کی سرپرستی ہی سے رہا اور یہ تحریک عام نہ ہونے پائی۔ یہی وجہ ہے کہ پردے میں بیٹھنے والی بیچاری عورتیں مصوّری تو ایک طرف، تصویریں دیکھنے سے بھی محروم تھیں۔

اس لحاظ سے یہ امر بڑا اہم ہے کہ انگریزی دور خاص کر بیسویں صدی کے اوائل میں بمبئی، کلکتہ اور لاہور میں مصوّری کا عام رواج ہُوا۔ اور جب تعلیم نسواں عام ہوئی تو عورتوں نے بھی اس فن کی طرف توجّہ کی۔ غیر مسلم خواتین میں سے کم سے کم ایک یعنی جوانا مرگ امرتا شیر گل نے مصوری میں بڑا نام پیدا کیا۔

سابق پنجاب میں خواتین نے خاص کر مصوّری کی طرف توجّہ کی۔ اس سلسلے میں پنجاب یونیورسٹی کا شعبۂ فنونِ لطیفہ جو صرف عورتوں کے لِئے مختص ہے بڑی غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ لڑکیوں کے لِئے مصوّری ایک اہم اور دلچسپ مضمون بن گئی۔ بہت سی نوجوان خواتین نے اس فن کی طرف توجّہ کی اور اس میں نام پیدا کیا۔

سابق پنجاب کی خواتین میں سب سے نمایاں نام زبیدہ آغا کا ہے۔ غالباً ساری دنیائے اسلام میں اور کسی خاتون نے مصوّری میں اتنی شہرت اب تک نہیں حاصل کی جتنی زبیدہ آغا کو حاصل ہوئی ہے۔ زبیدہ ۱۹۲۲ء میں لائل پور کے ایک قدیم اور معزّز گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ اور لاہور میں پنجاب یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ ۱۹۴۲ء میں زبیدہ آغا نے پنجاب یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کی۔ اور اس کے بعد ۱۹۴۴ء یس بی۔ سی سانیال سے مصوری کے درس لیتی رہیں۔

بہت جلد زبیدہ کی تصویریں قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھی جانے لگیں۔ چنانچہ ۱۹۴۵ء میں لاہور کی فنونِ لطیفہ کی ایک انجمن نے ایک نمائش میں زبیدہ کی تصویریں پیش کیں۔

۱۹۴۶ء میں آپ کی ملاقات ماریو پیرن جیسے ری سے ہوئی جو ایک ماہرِ فن اطالوی مصوّر ہیں۔ ان سے آپ کو مصوّری کے جدید ترین اسالیب سے اچھی طرح روشناس ہونے میں بڑی مدد ملی۔ زبیدہ کی طبیعت کا رُجحان جدیدیّت کی طرف تھا۔ اور اس کا باقاعدہ مطالعہ اور اس سے ذہنی اور روحانی قرب حاصل کرنا ان کے لئے ضروری تھا۔ ماریو پیرن جیسے ری سے یورپ کی جدید مصوّری کی تحریکوں کی باریکیاں سمجھنے میں زبیدہ کو بڑی مدد ملی۔

قیامِ پاکستان کے وقت آپ کافی شہرت حاصل کر چکی تھیں۔ اور پاکستانی مصوّروں میں اچھا خاصا امتیاز حاصل کر چکی تھیں۔ پاکستان بننے کے بعد جہاں ملک کی ثقافتی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا وہاں مصوّری کو بھی کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ عبدالرحمان چغتائی جو مغل مصوّری اور تہذیب کی روایات کو زندہ کر رہے تھے استقلالِ پاکستان کے بعد پاکستانی مصوّری کے خاص ترین نمائندہ سمجھے جانے لگے۔ فیضی رحمین جنہوں نے اپنی بے مثل تصویروں کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت حاصل کی تھی۔ وہ بھی پاکستان آ گئے اور

یہاں ایک تصویر خانے کی بنیاد ڈالی۔ ڈھاکہ میں زین العابدین نے جدید مغربی اور روایتی بنگالی مصوری کے میل جول سے ایک نئے مکتبِ فن کی بنا ڈالی۔ زبیدہ آغا کا شمار بھی مصوروں کی صفِ اولین میں ہونے لگا۔ اس زمانے میں کراچی، لاہور اور ڈھاکہ میں آرٹ کی نمائش کی تحریکیں زور پکڑنے لگیں۔ اور آرٹ کی نمائش کے لئے انجمنیں قائم کی جانے لگیں۔ چنانچہ ایک آرٹ کونسل کراچی میں قائم کی گئی۔ اس آرٹ کونسل نے ۱۹۴۹ء میں پہلی بار اکیلی زبیدہ آغا کی تصویروں کی نمائش کی۔ اس نمائش کا اخباروں میں بہت چرچا ہوا۔ موافق اور مخالف دونوں طرح کی رائیں دی گئیں۔ کچھ قدامت پسند نقادان کی جدیدیت کے خلاف تھے۔ لیکن بعض نے جدید تحریکِ مصوری اور زبیدہ آغا کے فن پر بڑے اچھے مضامین لکھے۔

پاکستان میں عام طور پر مصوری کا ذوق قدامت پسندی لئے ہوئے ہے۔ اور یہ ایک لحاظ سے قدرتی امر ہے۔ کوئی قوم اپنی ثقافتی میراث کو آسانی سے فراموش نہیں کر سکتی۔ لیکن زبیدہ آغا نے اس راستے سے ہٹ کر اپنے لئے مقام بنانے کی کوشش کی۔ اگر وہ اپنے پرانے تمدن کی روایات سے دُور ہیں تو دورِ جدید کی بین الاقوامی ہم آہنگی سے قریب تر ہیں۔ اب مصوری کی قدریں بدل چکی ہیں۔ مصوری محض تصویر کشی نہیں رہی۔ اب مصوری بہت سی علامات، بہت سے نفسی اظہارات اور رنگ و خط کے بہت سے تناسبوں کا نام ہے۔ اور تمام فنونِ لطیفہ کی طرح اس عہد کے فنی شعور نے مصوری کو بھی بہت سی آزادیاں دی ہیں۔ اور مصوری پر بہت سی پابندیاں عائد کی ہیں۔

زبیدہ آغا کی تصویروں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا رجحان دنیاوی نظام کی پابندی سے آزاد ہو کر حقائق کو اپنے طور پر پیش کرنے کی طرف ہے۔ فطرتاً وہ بہت ذکی الحس ہیں۔ ان کی مصوری کا نفسِ مضمون اور ان کا طریقِ اظہار دونوں

داخلیت پر مبنی ہیں۔ خارجیت پر نہیں۔ خارجی حقائق کا وہ اپنی مصوری کی رنگ و خط کی زبان میں چپکے سے ترجمہ کر لیتی ہیں۔ اور اسے کینوس پر پیش کرتی ہیں۔ اس لئے ان کی تصویریں خارجی اشیا سے مشابہ نہیں ہوتیں۔ وہ اپنے احساسات کا مصوری کے ذریعے ترجمہ کرتی ہیں۔ اور پھر انہیں اپنے خاص طریقۂ اظہار سے ادا کرتی ہیں، ان کی مصوری کی اپنی علامات اور اشکال و صور ہیں۔ یہ ان کی تصویروں میں بار بار نظر آتی ہیں۔ یہ سب داخلی ہیں۔ اور ان کی شخصیت اور ان کی داخلی جبلت پر مبنی ہیں۔ ان کے احساسات اور تخیلات دونوں میں بڑی گہرائی ہے۔ ان کے نزدیک تصویروں کی اشکال، یا رنگوں یا اسالیب کے مقابلے میں تصورات کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اور ان کی مصوری ایک طرح سے تصورات کی مصوری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مصوری پہلے شروع کی اور مصوری میں اچھی خاصی شہرت حاصل کر لی۔ اس کے بعد انہوں نے مصوری میں اعلےٰ تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ کیا۔

ان کا اطالوی استاد ماریو پرلن جیسے ری جنگ کے زمانے میں اطالیہ سے اسیر ہو کر آیا۔ ۱۹۴۲ء میں زبیدہ آغا نے اس سے بہت کچھ سیکھا۔ اور ان کی شاگردی میں انہیں اپنا راستہ تلاش کرنے میں مدد ملی۔ یہ شخص ماریو پرلن جیسے ری اس لحاظ سے ممتاز ہے۔ کہ یہ خود اس عہد کے مشہور ترین مصور پابلو پکاسو کا شاگرد ہے۔ پرلن جیسے ری ہی نے زبیدہ آغا کو روایت پسندی کی پابندیوں سے آزاد کرایا۔ اور زبیدہ کی ہمت بندھائی کہ ان کا اپنا راستہ انہی کا اپنا راستہ ہے۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۹ء تک زبیدہ نے جو تصویریں بنائیں ان سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی خودی کے اظہار کا راستہ تلاش کر رہی ہیں۔ اور اس میں انہیں کامیابی ہوتی جا رہی ہے۔ اپنی مصوری کے اس دور میں انہوں نے سنجیدہ رنگ استعمال کئے ہیں جن میں شوخی نہیں۔

لیکن ان تصویروں کے ساتھ ساتھ انہوں نے بعض تصویریں ایسی بھی بنائیں جن کا

پیرایۂ اظہار حقیقت سے زیادہ قریب ہے۔ مثلاً "کپاس چننے والیاں"۔ ان تصویروں میں اپنی گہری اور داخلی تصویروں کے مقابل ہم کو ایک ایسی زبیدہ آغا ملتی ہے جو فطرت کے مظاہر کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ ان کی قدر کرتی ہے اور انہیں سلیقے اور ادائگی سے پیش کر سکتی ہے۔

الغرض زبیدہ آغا کی ان دو طرح کی تصویروں میں ہمیں اس کی شخصیت کے دو پہلو ملتے ہیں۔ ایک داخلی اور ایک خارجی۔ یہ صفت محض زبیدہ آغا کی اپنی نہیں۔ اس عہد کے اکثر بڑے بڑے مصوروں کی تصویروں میں ہم ان دو متوازی اور متضاد پہلوؤں سے دو چار ہوتے ہیں۔ پکاسو اور ماتیس دونوں کی مصوری میں ہمیں دونوں طرح کی تصویریں ملتی ہیں۔

۱۹۵۰ء میں فن کی تکنیک پر مزید عبور حاصل کرنے کے لئے زبیدہ آغا نے یورپ کا رُخ کیا اور لندن کے ایک مشہور عقد کی۔ مدد سے سینٹ مارٹنس اسکول آف آرٹ میں داخل ہوئیں۔ اگلے سال ۱۹۵۱ء میں ٹرافرڈ گیلریز لندن میں ان کی تصویروں کی نمائش ہوئی۔

۱۹۵۱ء میں وہ فرانس آئیں اور پیرس کے مشہور عالم مدرسے "اکول دے بوزآرت" میں داخل ہوئیں۔ پیرس ہی میں ۱۹۵۲ء میں گیلری آنری ترونش میں ان کی تصویروں کی پھر نمائش ہوئی۔ یورپ میں طالب علمی کے زمانے میں انہوں نے بہت کچھ سیکھا اور ان پر یونانی اور بازنطینی مصوری کا اثر ہوا جو ایک لحاظ سے مشرق کی مصوری کے بنیادی اثرات میں سے ہے۔ یورپ کے تصویر خانوں اور یورپ کے استادوں کے فن کے نمونوں کا بھی زبیدہ آغا پر بڑا جلا اثر ہوا۔ ان کی تصویروں کے رنگ واضح ہونے لگے اور ان میں لطافت آ گئی۔

۱۹۵۳ء میں زبیدہ آغا پاکستان واپس آئیں۔ یورپ کے سفر کے بعد ان کی تصویروں

کی ہیئت میں نمایاں تبدیلی ہوگئی۔ صورت اور رنگ اور تناسب نے نئی شکل اختیار کی۔ اور مصورہ کی داخلی شخصیت، اور اس کے مشاہدات کے خارجی تاثر میں ایک ایسی ہم آہنگی پیدا ہوگئی جو پہلے بہت کم تھی۔

۱۹۵۵ء میں ان کی تصویروں کی دو نمائشیں اور ہوئیں۔ ایک تو جنوبی امریکہ میں ساں پاؤلو میں اور پھر کراچی میں۔ کراچی ہی میں تیسری بار ان کی تصویروں کی نمائش ۱۹۵۶ء میں ہوئی۔ ابھی زبیدہ آغا کی عمر زیادہ نہیں ہوئی۔ وہ ابھی پینتیس سال کی ہیں۔ لیکن اس عمر میں انہوں نے مصوری میں جو شہرت حاصل کی ہے وہ شاید کسی اور مسلمان عورت نے اس فن میں کبھی حاصل نہیں کی۔ ابھی تو ان کے فن کے آغاز اور پختگی کے مراحل آئے ہیں کمال کا مرحلہ اور آگے ہے اور آگے چل کے وہ یقیناً اس فن میں بڑا نام پیدا کریں گی:
